نوعمری کے وہ دن
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
میں کون ہوں...؟
جیلانی بانو

نوعمری کے وہ دن

میں کون ہوں...؟

ینگ انڈیا لائبریری

نوعمری کے وہ دن

میں کون ہوں...؟

جیلانی بانو

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

یہ کتاب نوعمری کے وہ دن عام عنوان کے تحت نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی طرف سے شروع کی گئی نوجوانوں میں قارئین کی ترقی کے لیے قومی ایکشن پلان (National Action Plan for the Readership Development Among Youth) کے تحت تیار کی گئی ہے۔

ISBN 978-81-237-7219-6

پہلا ایڈیشن: 2014 (ساکا 1936)

اصل، اردو

Main Kaun Hoon...?(Urdu)

قیمت: Rs 85.00

ناشر: ڈائریکٹر، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

نہرو بھون، 5 انسٹی ٹیوشنل ایریا، فیز-II

وسنت کنج، نئی دہلی-110070

Website: www.nbtindia.gov.in

میں کون ہوں...؟

رجاء.......رمشاء.......ریّان......؟

آؤ......تمہیں ایک کہانی سناؤں۔

ایک تھی بانو......

''ارے......بانو تو آپ ہی ہیں نا......؟'' رمشاء ہنس رہی ہے۔

''اُف......؟ کیا آپ اپنے آپ کو بھول گئی ہیں......؟'' رجاء تعجب سے پوچھ رہی ہے۔

''میں آپ کو بتا دوں بانو کون ہے......؟'' ریّان میرا چہرہ اٹھا کر پوچھ رہا ہے۔

وہ تینوں ہنس رہے ہیں،

اور میں ریّان کو دیکھ رہی ہوں۔

شاید ریّان مجھے بتا دے۔

میں کون ہوں......؟

میں کون ہوں......؟

یہ تو میں بھی سوچا کرتی ہوں۔

اب مجھ سے یہ فرمائش کی گئی ہے کہ میں اپنے بچپن کو یاد کروں، مگر یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو ہمارے سامنے نہیں ہے۔ جسے ہم بھول جائیں۔

اب جو افسانہ نگار جیلانی بانو، اپنے بچپن کے شاندار کارنامے سنا کر رعب جمانے کی کوشش کرے گی، وہ میں نہیں ہوں۔

ہاتھ میں قلم تھامے دور دور تک دیکھ رہی ہوں۔ بانو کون تھی...... کہاں تھی......؟

یادوں کے بادل سے امنڈے چلے آرہے ہیں۔ دور چلے جانے والے دن۔ وہ جگمگاتی یادیں۔ وہ ہنستے مسکراتے چہرے۔ جنھوں نے مجھے بولنا سکھایا۔ وہ پھیلے ہوئے ہاتھ جنھوں نے مجھے چلنا سکھایا۔ وہ آوازیں جو آج بھی پکار پکار کر کہتی ہیں۔

''ادھر مت جاؤ، اب آگے بڑھو، اب رک جاؤ۔''

میں کیا بولوں گی؟ کیا کھاؤں گی؟ کدھر دیکھوں گی؟ کب چپ رہنا ہے؟

میرا بچپن تو میرا ساتھ ہی نہیں چھوڑتا۔ جانے کب میں اتنی ناسمجھ تھی کہ مجھے اپنے آس پاس پھیلے ہوئے اندھیرے اجالے بھی نظر نہیں آتے تھے۔

میرے گھر کی کھڑکیاں بند رہتی تھیں، دروازے پر ایک پردہ پڑا رہتا تھا۔ کبھی اماں گھر سے باہر جاتی تھیں تو چادر میں منہ چھپا لیتی تھیں، اور ہمیں بھی ہر وقت سمجھاتی رہتی تھیں۔ ''لڑکیاں زور سے نہیں ہنستی ہیں۔ کھڑکی کھول کر باہر مت دیکھ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟، جہاں اماں اور خالہ بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔ وہ باتیں لڑکیوں کو نہیں سننا چاہیے، لڑکیاں زیادہ باتیں نہیں کرتیں۔ زور سے مت بولو۔ کیا......؟ اور کیوں......؟ ایسے سوال لڑکیاں نہیں کرتی ہیں۔''

ہم سات بہن بھائی تھے۔ غوثیہ ہم سے سات سال بڑی تھیں۔ اس لئے وہ ہمارے کسی کھیل میں شریک نہیں ہوتی تھیں۔ غوثیہ، بانو، مہر اور چار بھائی تھے۔ موئید حسن، آر آر لیب کے ڈائریکٹر تھے۔ ڈاکٹر افضل محمد، امبیڈکر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، احمد جلیس وہ ڈائریکٹر دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو۔ محی الدین حسن، مشہور ادیب اور آرٹسٹ۔

میری بڑی بہن غوثیہ مجھ سے سات سال بڑی تھیں۔ ہم انہیں بوآپا کہتے تھے۔ بہت سیدھی سادھی خوش مزاج خاتون تھیں۔ کتابیں پڑھنے کا، اچھے اچھے کھانے بنانے کا شوق تھا۔ انھوں نے بھی پرائیویٹ منشی فاضل کا امتحان دیا۔ میٹرک بھی پاس کرلیا تھا۔ وہ باتیں بہت کم کرتی تھیں۔ پکچر دیکھنے اور ریڈیو سننے

کا بھی شوق تھا۔ میں نے ان کی اس اداس سنجیدہ زندگی کے دکھوں کے بارے میں بہت بعد میں سنا تھا۔ بوآپا بارہ تیرہ برس کی تھیں تو بدایوں کے ایک اہم خاندان کے لڑکے کا ان کے لئے پیغام آیا تھا۔

بدایوں میں خاندان کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ایک سید گھرانے کی بیٹی کی شادی کسی پٹھان فیملی کے لڑکے سے نہیں ہوسکتی تھی، اورلڑکیوں کی شادی بہت کم عمری میں کردی جاتی تھی۔ بوآپا کا جس لڑکے کے لئے رشتہ آیا وہ بہت اچھے سید گھرانے کا تھا۔ شادی ہوگئی مگر اس لڑکے کی دماغی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

اب وہ خط آپ کو کیا سناؤں؟

چند برسوں بعد طلاق ہوگئی تھی۔ بدایوں کے رسم ورواج کے مطابق بوآپا کی دوسری شادی بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ بوآپا اب اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں۔ انھوں نے منشی فاضل کا امتحان دیا۔ ہر طرح کے ناول، افسانے، شاعری کی کتابیں پڑھا کرتی تھیں۔ سارے گھر کا انتظام کرتی تھیں۔ پکچر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہن بھائیوں کی تعلیم کا اور ان کی ہر ضرورت کا بہت خیال رہتا تھا انھیں۔

میری اور مہر کی انھیں بہت فکر رہتی تھی۔ ہم سے کہتی تھیں تم دونوں اچھی

طرح پڑھو۔ انھیں بدایوں سے اور بدایوں والوں سے بڑی نفرت تھی۔ اماں سے کہہ دیا تھا کہ بانو اور مہر کی شادی کسی بدایوں کے لڑکے سے مت کردینا۔

ان کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ ان کے ساتھ پکچر دیکھنے بھی جاتی تھیں۔

اماں کو ہائی بلڈ پریشر رہتا۔ ہاتھ پاؤں میں درد ہوتا تھا۔ اس لئے بوآپا سارے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ انھیں میری اور مہر کی تعلیم کی بھی بہت فکر رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں ہم دونوں اچھی طرح سے پڑھنے میں دل لگائیں۔

ان کی دو بہت اچھی دوست تھیں۔ بالا اور رما۔ ان کے ساتھ بوآپا اڈلی، ڈوسے اور بہت سے مزیدار کھانے بناتی تھیں۔ اپنی ان دوستوں کے ساتھ وہ تلگو میں ہی باتیں کرتی تھیں۔

اب سوچ رہی ہوں کہ میرا بچپن کہاں چلا گیا؟

اپنے بچپن کے بارے میں آپ کو کیا سناؤں؟

چاروں طرف دیکھ رہی ہوں۔ زندگی میں کوئی شاندار کارنامہ یاد نہیں آتا۔

میرے ابا علامہ حیرت بدایونی، یو۔ پی، بدایوں کے تھے۔ یہ علم وادب کے شیدائیوں کا بے حد قدامت پسند خاندان تھا۔ میرے دادا اور پردادا بھی عربی اور فارسی کے عالم، شاعر تھے۔ جب جاگیرداری دور ختم ہوگیا تو انھوں نے

انگریزوں کی نوکری کرنے سے انکار کردیا۔ میرے والد (ہم انھیں باوا کہتے تھے) اوران کے بھائی لکھنؤ اور کانپور گئے تعلیم حاصل کرنے کے لئے۔

باوا نوکری کی تلاش میں حیدرآباد گئے۔ اس وقت حیدرآباد علم وادب کا مرکز تھا۔ یو۔ پی، پنجاب، بنگال، ہر جگہ کے عالم، ادیب، شاعر حیدرآباد آرہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اردو ادب کا مرکز بن رہی تھی۔ باوا بھی مہاراجہ سرکشن پرشاد کی دلچسپی لینے سے حیدرآباد آگئے۔ امور مذہبی کے ڈپارٹمنٹ میں ایک بڑی پوسٹ پر کام کرنے لگے۔ ان کی شاعری اور علم وادب کا کام بھی ہوتا رہا۔ اردواور شاعری کی کتاب ''آئینہ'' اور فارسی شاعری کی کتاب ''البریق'' ہے۔ امیر خسرو کی فارسی شاعری پر ایک کتاب لکھ رہے تھے جو پوری نہ کر سکے۔ بچوں کے لئے بھی ''شہ سوار'' اور کچھ کتابیں لکھی تھیں۔

ہم بہن بھائی تو حیدرآبادی ہو گئے۔ مگر اماں بدایوں کونہیں بھول سکیں۔ ہماری زبان، کھانا پینا سب حیدرآبادی ہوگیا۔ ہماری آیا پچھی تھی۔ اس نے ہمیں تلگو میں باتیں کرنا سکھایا۔ وہ ہمیں تلگو کی کہانیاں سناتی تھی۔ مگر ہماری اماں بدایوں کونہیں بھول سکیں۔ بدایوں میں ان کے چار بھائی تھے۔ ایک بھائی ریاض فرشوری پاکستان چلے گئے تھے۔ چھوٹے بھائی قمر فرشوری دہلی میں تھے۔

اماں اپنے بھائی رحمٰن حسین فرشوری اور بہنوں سے ملنے بدایوں جاتی تھیں۔اماں اور باوا کے اور بھی بہت سے رشتے دار بدایوں میں تھے۔خاندانی گھر بھی تھا۔آل احمد سرور، شکیل بدایونی، دلاور فگار اور بہت سے اردو کے شاعر ادیبوں سے رشتے داری تھی۔

یو۔پی کی ایک مخصوص تہذیب تھی۔ایک مخصوص زبان تھی، لیکن بدایوں کو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا اور مجھے ابھی تک یاد ہے کہ بدایوں کی تہذیب، وہاں کی زبان کچھ الگ سی تھی۔

وہاں کے محلوں کے نام بھی ایسے تھے جہاں ایک ہی طبقے کے لوگ رہتے تھے۔سب مسلمان تھے مگر شیخ، پٹھان، سید، شیعہ، سنی۔یہ سب ایک مسجد میں بھی ساتھ ساتھ نہیں رہتے تھے۔

''سیدواڑہ'' جہاں صرف سید خاندان کے لوگ رہتے تھے۔

''فرشوری ٹولہ'' جہاں فرشوری خاندان رہتا تھا۔

''قاضی ٹولہ'' جہاں شاید کسی شہر کے قاضی صاحب نے گھر بنایا ہوگا۔

بدایوں والوں کی بول چال کی زبان بھی یو۔پی کے بولنے والوں سے کچھ الگ تھی۔''جیومتی...... (جانا مت)، کھیومتی...... (کھانا مت) وہ تھیاری دھسی

ہے؟ (وہ تمہاری بیٹی ہے؟) وہ تمہارا پوت ہے؟ (وہ تمہارا بیٹا ہے؟)

اس خاندان میں لڑکیوں کو اسکول نہیں بھیجا جاتا تھا۔ صرف مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر میرے چھوٹے ماموں قمر فرشوری لڑکیوں کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے بھائیوں کی بچیوں آسیہ، پروین، شبینہ کو اسکول بھیجا۔ انھوں نے میری تعلیم کو بھی ضروری سمجھا، کیونکہ مجھے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ چھوٹے ماما دہلی میں رہتے تھے اور میں حیدرآباد میں تھی۔ مگر انھوں نے مجھے کورس کی کتابیں بھیجی تھیں اور خود دہلی سے آکر مجھے پرائیویٹ میٹرک کے امتحان کی تیاری کروائی تھی اور جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن آئی تو چھوٹے ماما سب سے زیادہ خوش ہوئے تھے۔

بدایوں کے مخصوص کھانے بھی اماں بڑے شوق سے پکاتی تھیں۔ باوا کے دوست بدایوں کا پلاؤ، بدایوں کے مخصوص کھانے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

بدایوں کے پیڑوں کا ذکر کرشن چندر نے بھی کیا ہے۔

مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے ابا بھی ملازمت کے سلسلے میں بدایوں میں رہتے تھے۔ ہمارے نانا سے ان کی بہت دوستی تھی۔ پھر ان کا خاندان علی گڑھ چلا گیا۔ مگر سارے خاندان سے ان کی دوستی

باقی رہی تھی۔

جب میں افسانے لکھنے لگی تو عصمت چغتائی حیدرآباد آئیں۔ ہمارے گھر میں آئیں اور اماں سے ملنے گئی تھیں۔

اب میں آپ کو 1946 کی طرف لے جارہی ہوں۔ میں آپ کو اپنے بچپن کی کچھ باتیں سنانا چاہتی ہوں۔ کچھ یاد ہیں، کچھ بھول گئی ہوں۔

میڈل کلاس کے ایک خاندان میں جہاں سات بچے ہوں اس گھر کے بارے میں آپ کو کیا سناؤں......؟

ایک عالم، ایک شاعر کا گھر، کم آمدنی میں گزر بسر کرنے والی پریشانیوں میں گھری ہوئی اماں بیٹھی ہیں اور دوسرے کمرے میں علم وادب پر بحث کرنے ہندوستان کے مشہور شاعر، عالم، موسیقار بیٹھے ہیں۔ اچھے شعروں پر واہ واہ ہورہی ہے۔ کسی ادبی مسلئے پر بحث ہورہی ہے، مشہور موسیقار عارف رؤف، روشن علی کی سریلی تانیں گونج رہی ہیں۔

آیئے! میں آپ کو وہاں لے کر چلوں۔

ملا پلی، حیدرآباد کا ایک ایسا محلہ تھا جو عام لوگوں کی گزر بسر کرنے کے لئے گورنمنٹ نے بنایا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ کا نام تھا (آرائش کے) یہاں الگ الگ

محلوں میں گورنمنٹ نے کم کرائے کے مکان بنائے تھے۔ غریب محنت کش طبقے کے لئے ایک کمرہ کا چھوٹا سا گھر جس کا کرایہ تھا دو روپے۔ اس کے بعد بی کلاس کا گھر، دو کمرے چھوٹا سا ورانڈہ، اس کا کرایہ تھا پانچ روپے..... اے کلاس کا بڑا مکان تھا اس میں تین بڑے کمرے تھے، بڑا سا ورانڈہ تھا، کچن، اور بہت بڑا آنگن، اس کا کرایہ تھا دس روپے۔ ہم اس گھر میں رہتے تھے۔ اماں نے آنگن میں بہت سے پھلوں پھولوں کے درخت لگائے تھے۔ آم، جامن، انگور، پپیتا، ناریل اور پھر بیلا، گلاب، چمیلی اور بہت سے رنگین پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ایک طرف آنگن میں مرغیوں کا ڈربہ بھی تھا۔ جب مرغیوں کے چھوٹے چھوٹے چوزے آنگن میں گھومتے تھے تو یہ کھیل ہمیں بہت اچھا لگتا تھا۔

گرمی کا موسم آتا تھا تو سب آنگن میں پلنگ بچھا کر مچھر دانی لگا کر سوتے تھے بڑے آم کے پیڑ پر جھولا ڈلا ہوا تھا۔ سارے محلے کے بچے ہمارے آنگن میں کھیلنے کے لئے آجاتے تھے ہمارے مکان کا نمبر تھا 108۔

ہماری کرسچین سہیلیاں بھی تھیں۔ لِلی، ٹونی، جارج اور ہندو لڑکیاں بھی تھیں۔ بالا، نرملا اور دُرگا۔

کرسمس کے دن ہم اپنی کرسچین سہیلیوں کے گھر جاتے تھے۔ ہمیں ان کی

دعائیں بھی یاد ہو گئیں تھیں۔

ہماری آیا پچھی تھی اس کے ساتھ ہم مندر کو بھی جاتے تھے ہولی کے دن خوب سب مل کر ہولی کھیلتے تھے۔ ہمیں پوجا کے تلگوا شلوک بھی یاد ہو گئے تھے۔

دیوالی کے دن نرملا اور بالا کی طرح ہم بھی اپنے دروازے پر چراغ جلاتے تھے، آتش بازی بھی کرتے تھے۔

ہم جہاں رہتے تھے، اس محلے کا نام تھا ملا پلی۔ ملا پلی حیدر آباد کا ایک ایسا محلہ تھا جہاں شمالی ہند کے صوبوں کے شاعر، ادیب اور مشہور فن کار رہتے تھے۔ جہاں فانی بدایونی رہتے تھے۔ اس کا نام فانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہاں آج بھی ''فانی گراؤنڈ'' ہے۔

ملا پلی کی سب سے بڑی سڑک، حیرت بدایونی روڈ ہے۔ وہاں ان کا مکان 'ایوان حیرت' ہے۔

میرے والد علامہ حیرت بدایونی (ہم انہیں باوا کہتے تھے) ملازمت کے لئے حیدر آباد آئے تو پھر بدایوں نہیں گئے۔ وہ ایک مشہور شاعر تھے۔ عربی اور فارسی کے عالم تھے اور انہیں ہر فن سے دلچسپی تھی۔ خاص طور سے کلاسیکل موسیقی سننے کا بہت شوق تھا وہ کلاسیکل موسیقی کا فن جانتے تھے راگ راگنیوں کی پہچان

بھی تھی۔

ان کے دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ جوش صاحب باوا کو علامہ کہتے تھے اور اماں کو علامنی۔ ہم نے وہ زمانہ نہیں دیکھا، مگر اماں سناتی تھیں کہ فانی صاحب اور حیرت صاحب کے مکانوں میں حیدرآباد کے اور پورے ہندوستان کے ادیب، شاعر اور موسیقار آتے تھے۔ مشاعرے ہوتے، علمی ادبی محفلیں ہوتیں۔ موسیقی کے پروگرام ہوتے، اماں کے بنائے ہوئے کھانے سب کو پسند آتے تھے۔

اماں ہمیں سناتی تھیں کہ ہمارے گھر کے مشاعروں میں فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، ماہر القادری، جگر مرادآبادی، ہوش بلگرامی، حسرت موہانی، میر محفوظ علی، امجد طباطبائی، سکندر علی وجد، مخدوم، سبط حسن، یوسف ناظم، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، شکیل بدایونی اور بہت سے مشہور شاعر جب حیدرآباد آتے تھے تو ہماری ہاں ان کی دعوت ہوتی، مشاعرہ ہوتا تھا۔

یہ دور ہم نے نہیں دیکھا۔ مگر اماں کہتی تھیں کہ کسی سیاسی مسلئے میں الجھ کر کچھ برسوں تک حسرت موہانی بھی ملاپلی میں رہنے کو آ گئے تھے۔ وہ صبح کے وقت کاندھے پر جلانے کی لکڑیوں کا بنڈل اٹھائے ہاتھ میں ترکاری کی ٹولی لے کر جاتے تھے۔

مگر ہم نے تو ملا پلی میں آج کے اہم ادیبوں کو دیکھا جو ملا پلی میں رہتے تھے۔ جوگیندر پال، عیاذ انصاری، عوض سعید، انور معظم شاذ تمکنت، واجدہ تبسم، غلام جیلانی، مصحف اقبال توصیفی، جمیلہ نشاط، مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد نشا اور کئی مشہور کرکٹ پلیئر، موسیقار، آرٹسٹ اس محلے میں اس طرح رہتے تھے جیسے سب ایک دوسرے کے عزیز دوست ہوں۔ عبدالحق صاحب کے ساتھی غلام یزدانی صاحب بھی ملا پلی میں رہتے تھے، جب شہر میں کوئی مشاعرہ ہوتا تھا تو پھر ان سب شاعروں کی ہمارے گھر دعوت ہوتی تھی۔ مشہور موسیقاروں کے پروگرام بھی ہوتے تھے۔ گھر میں ہارمونیم اور طبلے کی جوڑی تھی باوا امور مذہبی کے ایک اہم عہدے پر تھے۔

اس وقت حیدرآباد میں صرف عثمانیہ یونیورسٹی اور دوسرے شعبوں میں ہی اچھا کام نہیں ہو رہا تھا بلکہ "محکمہ آرائش بلدہ" ایک ڈپارٹمنٹ تھا جو پورے شہر کو نئے کالج، نئے بازار اور نئی بستیاں بنا کر حیدرآباد کو ایک اہم شہر میں تبدیل کر رہے تھے۔ مہدی نواز جنگ ایک جاگیردار تھے جنھوں نے ہزاروں ایکڑ زمین پر مہدی پٹنم اور اس کے آس پاس ایک نیا شہر بنا دیا تھا اور پھر بعد میں بنجارہ ہِل تک یہ شہر پھیل رہا تھا۔ نئی بستیوں کے لئے مکان بنائے جا رہے تھے۔

ملاپکی یہ ایک بہت بڑی کالونی بنائی گئی تھی۔

ملاپکی پرانے شہر سے دور لال ٹیکری کے آس پاس ایک نئی بستی تھی یہاں تین طرح کے مکان گورنمنٹ نے بنائے تھے۔غریب مزدوروں، باغ عام کے مالیوں اور چپراسیوں کے لئے اس مکان میں کمرہ، ایک چھوٹا سا آنگن اور کچن تھا۔اس مکان کا کرایہ دو روپے تھا۔بی کلاس کا گھر، دو کمرے چھوٹا سا ورانڈہ، اس کا کرایہ تھا پانچ روپے۔اے کلاس کا بڑا مکان تھا اس میں تین بڑے کمرے تھے، بڑا سا ورانڈہ تھا، کچن، اور بہت بڑا آنگن، اس کا کرایہ تھا دس روپے۔ہم اس گھر میں رہتے تھے۔اماں نے آنگن میں بہت سے پھلوں پھولوں کے درخت لگائے تھے۔آم، جامن، انگور، پپیتا، ناریل اور پھر بیلا، گلاب، چمبیلی اور جانے کیا کیا پھولوں پھلوں اور ترکاریوں کے درخت تھے، لیکن اس مکان کا کرایہ دس روپے تھا اور یہ کرایہ اتنا زیادہ لگتا تھا کہ اماں اس کے لئے پریشان رہتی تھیں۔چار مہینے مکان کا کرایہ نہیں دیا تو نوٹس آجاتا تھا۔

چاروں بھائی اسکول جاتے تھے۔اسکول کی فیس تھی دو روپے۔

ایک نابینا مولوی صاحب ہم سب کو قرآن شریف پڑھانے آتے تھے۔ انھیں پانچ روپے ملتے تھے، اماں اور ماموں جان لڑکیوں کو اسکول بھیجنا پسند نہیں

کرتے تھے، اور پھر اسکول کی فیس اور جانے کا بھی مسئلہ تھا۔ لیکن باوا لڑکیوں کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہم تینوں بہنوں کی تعلیم کا گھر پر ہی انتظام کیا تھا۔ وہ خود پڑھاتے تھے۔ کورس کی کتابیں آ گئیں تھیں۔ باوا کے ایک دوست ہمیں انگلش پڑھانے آتے تھے۔ میں نے اسی طرح پڑھ کر پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دیا تھا اور فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ بعد میں میں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی پرائیویٹ دیا تھا پھر میری شادی ہوگئی تو میں نے شادی کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ بی۔ اے۔ کیا تھا اور پھر جامعہ ملیہ دہلی سے ایم اے کیا تھا۔ چھوٹی بہن مہر نے بھی ڈرائینگ کے امتحان دیئے تھے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھتی تھی۔ اماں ہمیں کروشیا کے کام سکھاتی تھیں۔ سوئیٹر بننا، کپڑے سینا، مشین چلانا بھی سکھاتی تھیں۔

ہمارے پڑوس میں ایک اسکول ٹیچر عظیم الدین صاحب رہتے تھے۔ ان کے تین بچے تھے، شمیم، وسیم۔ فریدہ۔ ان بچوں کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس لئے ہماری اماں ان بچوں کو بہت چاہتی تھیں۔ فریدہ تو ہمارے ہی ساتھ رہتی تھی۔ فریدہ کو سنگیت سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ وسیم کے ساتھ سنگیت سیکھنے کسی استاد کے پاس جاتی تھی۔

جب ہم اپنے آنگن کے کھیل میں ڈرامے کرتے تھے تو اس میں فریدہ، وسیم کا گانا بھی ہوتا تھا۔ ان ڈراموں میں چارلی کی ایکٹنگ کی نقل ہوتی یا پھر کسی فلم کی کہانی کا ڈرامہ میں بنا دیتی تھی۔ حسن اور مہر بڑی محنت سے آنگن میں پردے باندھ کر اسٹیج بنا دیتے تھے۔ ڈرامہ دیکھنے کے لئے پورے محلے کے بچے آجاتے تھے۔ اس ڈرامے میں للّی اور ٹونی کا ڈانس ہوتا تھا، احمد اور وسیم کی کامیڈی، فریدہ اور وسیم کے گانے ہوتے۔ اس ڈرامے کا ٹکٹ بھی ہوتا تھا ایک آنہ۔

ہمیں عید کا بھی بہت انتظار ہوتا تھا کہ عید کو نئے کپڑے پہن کر شیر خورمہ کھائیں گے۔ پھر عیدی بھی ملے گی۔ ایک روپیہ باوا دیتے تھے اور ایک روپیہ ماموں جان۔ باوا کے ایک دوست تھے حمید الدین، وہ ڈپٹی کمشنر پولیس تھے۔ وہ ہمیں عید کے دن دو روپے دیتے تھے اور ایک روپیہ باوا کے دوست بشیر چچا دیتے تھے۔ اس عیدی کے ملنے کا ہم سال بھر انتظار کرتے تھے۔ بڑے بڑے پلان بناتے تھے کہ اتنے روپے کیسے خرچ کریں گے۔ جب بھی کوئی اچھی چیز نظر آتی تو سوچ لیتے تھے کہ جب عیدی ملے گی تو یہ گڑیا، یہ باجا، یہ مٹھائی خرید کر کھائیں گے۔

ملاپلی کے پاس جنگم بستی تھی، وہاں دو روپے کرائے والے گھروں میں

غریب لوگ رہا کرتے تھے، جنگم بستی میں جب ''بدھ کتھا'' ہوتی تھی تو پھپھی کے ساتھ وہاں جانے کے لئے اماں کی بہت خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ ''بدھ کتھا'' کا پروگرام رات میں دو تین گھنٹے تک ہوتا تھا۔ چار پانچ مرد ناچ گانے کے ساتھ کتھا سناتے تھے یہ مرد ساڑی پہن کر میک اپ کر کے عورت بن جاتے تھے۔ کوئی رام بنتا کوئی راون، کوئی بھوت بنتا تو کوئی دیوتا بنتا تھا۔ ''بدھ کتھا'' سب مل کر ناچ گانے کے ساتھ سناتے تھے۔ ڈھول اور سارنگی بجانے والے گاتے ہوئے کہانی سناتے تھے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی اٹھ کر اس ناچ گانے میں شریک ہو جاتے تھے، اچھے گانے پر، اچھی ایکٹنگ پر لوگ تالیاں بجاتے، اداکاروں پر روپے پیسے پھینکتے تھے۔

جب رام اور سیتا کی کہانی ختم ہو جاتی تھی تو کامیڈی پروگرام شروع ہو جاتا تھا ساس بہو کی لڑائی، شرابی مردوں کی حماقتیں، اور آخر میں سب اداکاروں کے ساتھ ڈرامہ دیکھنے والے لوگ اٹھ کر ناچنے لگتے تھے۔

''بدھ کتھا'' کے گیت بہت پسند کئے جاتے تھے اور سب بچوں کو وہ گیت یاد ہو جاتے تھے۔ ہم سب اپنے گھروں میں بھی ''بدھ کتھا'' کا پروگرام کرتے تھے۔

وسیم راون بنتے، ہاتھ میں لکڑی کی تلوار لے کر آ جاتے تھے۔ احمد رام بنتے اور فریدہ سیتا بنتی۔ مہر کو بدھ کتھا کی کہانی یاد ہو جاتی تھی اور وہ جب وہ کہانی گا گا کر سناتی تھی تو گھر کے بڑے لوگ بھی یہ پروگرام دیکھنے کے لئے دالان میں آ کر بیٹھ جاتے تھے اور باوا سب بچوں کو ایک ایک چونّی انعام بھی دیتے تھے۔ مگر رات کو جب میں سونے سے پہلے احمد اور پاشاہ کو سیتا اور رام کی کہانی سناتی تھی تو راون کے جھوٹ بولنے اور سیتا پر اتنا ظلم کرنے پر اسے خوب سزا دیتی تھی اور رام اسے تلوار سے مار ڈالتے تھے۔ مگر وسیم، شمیم، افضل اور حسن مجھے ڈانٹتے تھے کہ تم نے کہانی کیوں بدل ڈالی۔ مگر سیتا کے ساتھ راون کی کوئی بری حرکت کرنے کی ایکٹنگ بھی مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ میری ایسی ضد کرنے پر حسن، مہر، افضل، فریدہ، احمد سب میک اپ اتار کر اسٹیج کو توڑ کر ادھر ادھر بھاگ جاتے تھے۔

جب مہابھارت کی لڑائی شروع ہوئی تو کرشن نے ارجن کو جو سبق پڑھائے تھے جو نصیحتیں کی تھیں وہ پچھمی تلگو میں گا گا کر سناتی تھی۔

باوا کے دوست آتے تھے تو دیوان خانے میں شطرنج کھیلی جاتی تھی۔ ہار جیت کی چیخ پکار ہوتی تھی۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، (شکیل صاحب رشتے میں باوا کے بھائی تھے) جوش ملیح آبادی

(جوش صاحب نے اپنی کتاب ''یادوں کی برات'' میں ان دعوتوں کا دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔)

جب ہمارے گھر میں شاعر آتے تھے تو بچوں کو وہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے ہم بہن بھائی آنگن میں ایک بوریا بچھا کر ان شاعروں کا تماشہ دیکھتے تھے۔ مجھے وہ شاعر آج بھی یاد آتے ہیں، جُبّا قبا میں جھومتے ہوئے لمبی داڑھی والے انور صابری، کالی شیروانی پہنے ہوئے ایڑیوں کے بل اچکتے ہوئے، روش معدّتی، چھوٹی سی داڑھی بکھیرے ہوئے سفید بالوں والے جگر مرادآبادی، کنور مہندر سنگھ بیدی کی بڑی سی داڑھی اور آسمان کو چھوتی ہوئی پگڑی، گاتے گنگناتے ہوئے شکیل بدایونی، سفید شیروانی پہنے خوش مزاج سکندر علی وجد، ہاتھ اٹھا کر رک رک کر شعر سنانے والے کیفی اعظمی، ان کی گرج دار آواز گھر سے باہر سارے محلے میں گونجتی تھی۔ معمولی سا پینٹ شرٹ پہنے دبلے پتلے سے مخدوم جو ہر ایک کی بات غور سے سنتے تھے اور کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ کس کس کو یاد کروں؟ ان سب الگ الگ صورتوں اور مزاجوں والے شاعروں میں کوئی چیز مشترک تھی تو سر سے پیر تک ان کی بے ترتیبی، زندہ دلی، علم و ادب سے ان کی سچی لگن۔ ایسا لگتا تھا اللہ میاں نے ان شاعروں کے بکھرے ہوئے

عناصر میں ظہور ترتیب ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شعر سنانے کے ان کے مخصوص انداز تھے اور ان کے قہقہے سارے محلے میں گونجتے تھے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آج بھی میں وہ آوازیں سنتی ہوں۔

جس رات گھر میں شاعروں کا مشاعرہ ہوتا تھا تو ہم سب بہن بھائی دور بیٹھ کر ان کا کلام سنتے تھے۔ دوسرے دن اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مشاعرے کا کھیل ہوتا تھا۔ ان شاعروں کے شعر ہمیں زبانی یاد ہو جاتے تھے۔

میرے بھائی احمد جلیس کیفی اعظمی کے انداز میں گھوم گھوم کر شعر سناتے تھے۔ ایک بار باوا نے شکیل سے کہا کہ احمد تمہاری بہت اچھی نقل کرتا ہے، انھوں نے احمد کو بلا کر بہت پیار سے بہت اصرار سے اپنی غزل اپنے ترنم میں سنی اور خوش ہو کر احمد کو دس روپے دے دیئے۔ دس روپے......؟ ہم سب خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ یہ بہت بڑا انعام تھا۔

فجر کی اذان ہوتی تھی تو باوا ہم سب کو اٹھا دیتے تھے ''صبح ہو گئی، اٹھو، نماز پڑھو، قرآن شریف پڑھو۔''

''ابھی تو بہت اندھیرا ہے۔'' میں رضائی ہٹا کر ادھر ادھر دیکھتی تھی اور پھر مہر کو بھی اٹھا دیتی تھی۔ مہر آنکھیں ملتی ہوئی اٹھتی تھی تو اسے مسجد کے موذن پر غصہ آتا

تھا۔ ''یہ موذن اتنی جلدی کیوں اٹھ جاتا ہے۔''

مگر صبح جلدی اٹھنے کی یہ عادت آج بھی ہے۔ دن نکلنے سے پہلے میں بستر سے اٹھ جاتی ہوں۔ حسن، افضل، احمد، پاشا اسکول چلے جاتے تھے۔ ہم تینوں بہنیں کمرے میں دری بچھا کر پڑھنے بیٹھ جاتی تھیں۔ باوا نے میٹرک کے کورس کی کتابیں دی تھیں۔ پھر مہر پینٹنگ کرتی تھی، میں کہانیاں لکھتی تھی۔

اسکول کے بعد حسن، افضل، احمد اور پاشا بھی اسی کمرے میں آجاتے تھے۔ حسن گراموفون پر سہگل، اختری بانو فیض آبادی، ہیرابانو بروڈکر اور جانے کس کس کے کلاسیکل گانے والوں کے ریکارڈ لگاتے تھے اور ساتھ ساتھ خود بھی گاتے تھے۔ مہر کو بھی گانے کا شوق تھا، وہ اپنی سہیلی فریدہ کے ساتھ مل کر گاتی تھی۔ فریدہ اور اس کا بھائی کلاسیکل سنگیت سیکھنے بھی جاتے تھے۔ مہر کو یہ گیت بہت پسند تھا ''میرے چھوٹے سے من میں چھوٹی سی دنیا رے'' ایسے وقت کبھی ماموں جان آجاتے تھے تو ڈانٹ کر پوچھتے تھے ''ابھی کون گا رہا تھا، لڑکیوں کی آواز سڑک پر سنائی دے رہی ہے۔'' مجھے ایسی باتوں پر غصہ آتا تھا، میں اماں سے پوچھتی تھی ''میں اور افضل بھی تو گاتے ہیں انھیں کیوں نہیں روکتے؟''

ہماری دو اور سہیلیاں تھیں، ریحانہ اور قمر، وہ آغا پور میں رہتی تھیں۔ ان کے

ماما کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ ریحانہ ہمیں چھٹی لکھ کر اس لڑکے کے ہاتھ سے بھیجتی تھی۔ ہم بھی اسی وقت جواب لکھ کر اسے دے دیتے تھے۔ ان خطوں میں آئندہ کھیلنے والے کھیلوں کے پروگرام ہوتے تھے کبھی کبھی پوسٹ مین آ کر ایک خط دے جاتا تھا۔ یہ خط باوا کے کسی دوست کا ہوتا تھا۔ یا پھر بدایوں سے اماں کے کوئی بھائی انتہائی اہم خبر سنانے کے لئے خط لکھتے تھے۔ اس لئے پوسٹ مین کی آواز سن کر اماں گھبرا جاتی تھیں۔ اس زمانے میں فون نہیں تھا، اس لئے ٹیلی گرام کوئی بری خبر لے کر آتا تھا۔ یا پھر کسی کے آنے کی خبر ہوتی تھی۔ اماں ٹیلی گرام والے کی آواز سن کر گھبرا جاتی تھیں۔ ہاتھ جوڑ کر دعا مانگنے لگتی تھیں کہ کوئی بری خبر نہ آئی ہو۔ اماں ٹیلی گرام کو تار کہتی تھیں اور اکثر کوئی بری خبر ہی لے کر تار آتے تھے۔ کسی کی بیماری کی خبر، کسی کے مر جانے کی خبر یا پھر خاندان کی لڑائی جھگڑے جو جائیداد کی تقسیم کے لئے برسوں سے چل رہے تھے۔

چاروں بھائی اسکول جاتے تھے۔ اسکول کی فیس تھی ایک روپیہ، اماں نے لڑکیوں کو اسکول نہیں بھیجا۔ سب بچوں کو پڑھانے کا انتظام کیسے ہوتا؟ اماں کم آمدنی اور زیادہ خرچ کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھیں۔

ہم سب بہن بھائی اور پھر پڑوس کے بچوں کے ساتھ مل کر نئے نئے کھیل

ڈھونڈتے تھے۔ ہم سب کو اچھے ایکٹروں اور شاعروں کی نقل کرنا، ڈرامے کرنا، گانے کا بہت شوق تھا۔ محلے کے نالائق لڑنے والے بچوں کے ساتھ ہم نہیں کھیلتے تھے۔ ہم پینٹنگ کرتے تھے، میوزک پارٹی ہوتی، مشاعرے ہوتے، اپنے ہاتھ سے کاپیوں میں لکھ کر رسالے اور اخبار تیار کرتے تھے، ان کتابوں اور اخباروں میں ایک دوسرے کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ کبھی میوزک پارٹی ہوتی، کبھی بیت بازی ہوتی، اچھا شعر سنانے پر باوا انعام دیتے تھے۔ غلط شعر پڑھنے پر جرمانہ ہوتا تھا، اب غلط شعر پڑھنے والے کو تین اچھے شعر سنانے پڑھتے تھے۔ باوا ہمیں شعروں کا مطلب بھی سمجھاتے تھے۔

گاندھی اور نہرو کے قصے، ہندوستان میں انگریزوں کے آنے کی اور پھر انھیں ہندوستان سے باہر نکالنے کے لئے لیڈروں کی باتیں بھی سنایا کرتے تھے۔

ٹی وی نہیں تھا، بچوں کو اس وقت ریڈیو سننے کی اجازت بھی نہیں تھی، مجھے اور میری بہن مہر کو پینٹنگ کرنے کا شوق تھا۔ ہم دونوں سارے دن پرانے کاغذوں پر پینٹنگ کرتے تھے۔ مٹی کے سکوروں میں رنگ گھول لیتے تھے، پرانے کاغذوں پر پینٹنگ کرتے تھے۔ افضل محمد اور احمد جلیس پورا رسالہ ایک کاپی پر لکھ کر ایک رسالہ نکالتے تھے۔ مہر اس رسالے کا بہت اچھا ٹائٹل کور

بناتی تھی۔ ہم اس کے لئے کہانیاں لکھتے تھے۔ احمد جلیس مزاحیہ مضمون اور لطیفے لکھتے تھے۔

ہمیں تلگو کے گیت بھی یاد ہو گئے تھے۔ ہولی، دیوالی میں سب مل کر ڈانس کر کے تالیاں بجا کر گیت گاتے تھے وہ گیت ہمیں اب بھی یاد ہے۔ مگر مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ میں پہلے بچوں کے لئے کہانیاں لکھتی تھی، پھر جب باوا ہمیں سناتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزوں کو نکالنے کے لئے ہمارے لیڈروں نے کتنی قربانیاں دیں، ان پر کیا کیا ظلم ہوئے تھے، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے کیا کیا تھا۔ مجھے چاچا نہرو بہت پسند تھے، اخباروں میں سے میں ان کے سب فوٹو کاٹ کر جمع کر لیتی تھی۔ میں نے ان کی ایک تصویر بھی بنائی تھی۔ ان پر ایک کہانی بھی لکھی تھی جو برسوں کے بعد نیشنل بک ٹرسٹ نے انگلش اور اردو میں چھاپی ہے۔ افضل محمد اور احمد جلیس کے بیچ ان رسالوں میں معاصرانہ نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

لیکن ایڈیٹروں کے انداز میں اس طرح سے تنقید کرتے تھے جیسے آج جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام لیوا ترقی پسند ادیبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کوئی کہانی لکھے، گیت گائے، پینٹنگ کرے یا توڈرامے تیار کرے، یہ ہر

فن مولا فوراً اپنے طنز کے نوکیلے نشتروں سے سرجری شروع کردیتے تھے۔اس لئے بور ہوکر گھر میں پینٹنگ کرنے بیٹھ جاتے تھے۔

حسن، احمد جلیس اور پاشا اور ان کے دوست وسیم، شمیم کو کامیڈی ڈرامے اسٹیج کرنے کا شوق تھا۔خالی ڈبوں کا باجا بجا کر ناچ گانا ہوتا تھا۔ڈرامے اسٹیج کرنے کا بہت اہتمام ہوتا تھا۔اماں اور بوآپا کی ساڑیاں باندھ کر اسٹیج بنایا جاتا تھا۔اماں کے غرارے پہن کر دوپٹے اوڑھ کر عورت بنتے ۔حسن، افضل، احمد شیروانی پہن کر سر پر دستار سجا لیتے تھے۔مغل اعظم کی فلم شروع ہوجاتی تھی۔

لیکن کوئی اچھا کامیڈی ڈرامہ نہیں ملتا تھا تو میں ایک ڈرامہ لکھتی تھی۔ہماری ایک خالہ کبھی کبھی بدایوں سے آجاتی تھیں تو ہم سب کی دیکھ بھال کرتیں۔وہ ہمیں سمجھاتی تھیں کہ لڑکیاں زور سے نہیں ہنستی ہیں، سر پر پلو ڈالو، پردہ کرو، جھوٹ مت بولو، کام کرنا سیکھو، اپنے کپڑے خود سیا کرو، نماز پڑھو، ہر وقت ہم سب کو ڈانٹتی رہتی تھیں۔

پھر میں نے اب کی بار ایک ڈرامہ لکھا اور حسن سے کہا ''آج ہم یہ ڈرامہ کھیلیں گے'' اس ڈرامے کا نام تھا ''ایک دن کی بادشاہت'' اس ڈرامے میں للّی اپنی دادی سے کہتی ہے کہ دادی ایک دن تم للّی بن جاؤ اور میں دادی بن جاؤں

گی۔ میں سارا دن جو کہوں گی تم وہی کروں گی۔ دادی للی بن جاتی ہیں تو للی کی ڈانٹ سنتی ہیں سارا دن وہ ہر کام کو کرنے سے روکتی ہے تو دادی کو خیال آتا ہے کہ وہ للی پر کتنا ظلم کرتی ہیں اور وہ پیار کر کے کہتی ہیں ''تم جو کرنا چاہتی ہو تم وہ کرو۔''

مگر جب ہم نے اس ڈرامے کی پوری تیاری کر لی تو ماموں جان آ گئے ڈرامہ نہیں ہوا۔ ماموں جان ہم سب کو ایسے کھیل نہیں کھیلنے دیتے تھے۔ اس لئے ماموں جان کے آتے ہی سب اپنا میک اپ اتار کے کہیں چھپ جاتے تھے۔ میں نے وہ کہانی حیدر آباد سے نکلنے والے بچوں کے ایک رسالے ''تارے'' کو بھیج دی تھی۔

''شمع'' کے ایڈیٹر یوسف دہلوی بھی بچوں کا ایک رسالہ ''کھلونا'' شائع کرتے تھے۔ میں نے تارے کے لئے بھی کہانیاں لکھی تھیں۔

رفعت سروش، آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے بچوں کا پروگرام کرتے تھے۔ بچوں کا وہ پروگرام بہت اچھا ہوتا تھا۔ ہم سب وہ پروگرام بڑے شوق سے سنتے تھے۔ جب ماموں جان کے ڈر سے وہ ڈرامہ اسٹیج نہیں ہو سکا تو ہم نے وہ ڈرامہ بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیا پھر ڈرنے لگے کہ ڈرامہ واپس آئے گا تو سب بہن

بھائی مذاق اڑائیں گے۔ رفعت سروش باوا کے دوست تھے۔ انھوں نے وہ ڈرامہ بچوں کے پروگرام میں شامل کرلیا، اوراس کا معاوضہ دس روپے بھیج دیا۔ دس روپے...... یہ ہماری کہانی کا انعام ملا تھا۔ دس روپے......؟ سب بہن بھائی خوش ہو گئے۔ اس وقت دس روپے بہت بڑی رقم تھی اماں باوا نے بھی وہ ڈرامہ سنا تو بہت خوش ہوئے۔

ہمارا لکھا ہوا ڈرامہ ریڈیو سے نشر ہوا ہے۔ بس پھر ہم نے سوچا کہ اب اور کہانیاں لکھوں گی اور ''کھلونا'' اور ''تارے'' کو بھیجوں گی۔

میری اماں کو بھی اچھی اور ادبی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ ایک لائبریری سے کتابیں اور رسالے منگواتی تھیں۔ باوا کے دوستوں سے پردہ کرتی تھیں، مگر ان کی شاعری اور دوسرے ادبی مسائل کو شوق سے سنتی تھیں۔ باوا کے پاس ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے ادبی رسالے آتے تھے۔ ''ادب لطیف'' ''شاعر'' ''خاتون مشرق'' ''عصمت'' ''شمع'' ''نگار'' ''شاہراہ'' اور نہ جانے کون کون سے رسالے آتے تھے۔ ادیبوں، شاعروں کی کتابیں بھی آتی تھیں۔ ایک بار میں نے اماں کے تکیے پر سے عصمت چغتائی کی ''ٹیڑھی لکیر'' اٹھا کر پڑھنا شروع کی تھی تو اماں نے وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے لی تھی۔ ''یہ کتاب

لڑکیوں کے پڑھنے کی نہیں ہے۔ جاؤ تم اپنی کتابیں پڑھو۔"

لیکن باوا ہم سے کہتے تھے سب کتابیں پڑھو۔ انگلش لکھنا، پڑھنا سیکھو۔ مشکل شعروں کا مطلب سمجھاتے تھے۔ مذہبی مسائل کیا ہیں؟ سیاسی مسائل کیا ہیں؟ برٹش گورنمنٹ کا ہندوستان میں راج کیوں ہوا؟ ہندوستان پاکستان کا بٹوارہ کیوں ہوا؟ دکن میں شاہی نظام کیا تھا؟ وہ کیوں ختم ہوا۔ باوا عملی طور پر تو پارٹی کے لئے کام نہیں کرتے تھے مگر مخدومؔ، راج بہادر گوڑؔ، اختر حسنؔ، سلیمان اریبؔ اور سب ہی ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ تھے۔ ان کے ادبی جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

ہم رات کو اپنی آیا پچھمی کے ساتھ زمین پر بستر بچھا کر سو جاتے تھے۔ پچھمی ہم سے تلگو میں بات کرتی تھی۔ کہانیاں سناتی تھی۔ سیتا اور راون کی کہانیاں اپنے خاندان کی لڑائی جھگڑے۔ گاؤں میں کسانوں پر ہونے والے ظلم کے قصے۔

پچھمی کے ایک بھائی کو کسی جاگیردار نے دو سو روپے دے کر ایک سال کے لئے رہن رکھ لیا تھا۔ آندھرا پردیش میں آج بھی باؤنڈیڈ لیبر سسٹم ہے۔ دس پانچ ہزار روپے دے کر چھوٹے بچوں کو، عورتوں کو بندھوا مزدور بنا لیتے ہیں۔ اگر وہ کام نہ کر سکے تو ان کے بھائی یا بہنوں کو کرنا پڑتا ہے۔

گاؤں سے پھپھی کے رشتے دار آتے تھے بوڑھے بیمار، نوجوان لڑکے اور عورتیں شہر میں نوکری اور مزدوری ڈھونڈنے آتی تھیں۔ پھپھی نے ہمیں سنایا تھا کہ اس کی ایک چھوٹی بہن بالا بہت تیز مزاج کی ہے۔ وہ جاگیرداروں اور زمین داروں سے لڑتی ہے۔ ان کے خلاف گاؤں کے نوجوانوں کو سکھاتی ہے کہ انھیں کیسے ستائیں۔ ان کا کام نہ کریں۔ اس لئے گاؤں کے ساہوکار اسے پکڑ کے مارنے والے ہیں۔ وہ دوسرے گاؤں میں جا کر چھپ گئی ہے۔

پھپھی سے سنی ہوئی یہ کہانیاں میرے ساتھ رہیں۔ شاید گاؤں والوں کے یہ دکھ سن کر ہی میں نے کئی برسوں بعد اپنا پہلا افسانہ ''روشنی کے مینار'' لکھا تھا۔ اور اس افسانے کو سارے ادیبوں نے پسند کیا تھا۔

''ادب لطیف'' کے ایڈیٹر مشہور ادیب مرزا ادیب نے لکھا تھا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے جیلانی بانو کا پہلا افسانہ اپنے رسالے میں شامل کیا تھا۔

پھپھی کے ساتھ ہم مزدوروں کی بستی میں ''بدھ کتھا'' سننے جاتے تھے۔ ''بدھ کتھا'' کھلاڑیوں کی ایک ٹولی ناچ گا کر ہارمونیم ڈھول تاشے بجا کر سناتی تھی۔ ''دیومالا'' اور بھگوت گیتا کے قصے، رام، کرشن بھگوان کے اپدیش سنائے جاتے تھے۔ ہولی کے دن اپنی ہندو سہیلیوں اور پھپھی کے رشتے داروں کے ساتھ

ہولی کھیلتے۔ مندر میں میلا لگتا تھا۔ بھجن گائے جاتے، ڈانس بھی ہوتا تھا، تلگو کے گیت ہمیں بھی یاد ہوگئے تھے۔ کبھی ہمیں مٹھائی اور کھلونے خرید کر دیتی تھی۔

ہمارے باوا کو لڑکیوں کی تعلیم کی بڑی فکر تھی۔ تعلیم کے ساتھ وہ ہماری دوسری دلچسپیوں کو بڑھانا چاہتے تھے۔ باوا نے اپنے بچوں کو صرف اسکول کی تعلیم ہی نہیں دی، بلکہ انھوں نے ادب، آرٹ، موسیقی سکھانے کی بھی کوشش کی۔ عام والدین کی طرح انھوں نے ہمیں کبھی ڈانٹا اور نہ مارا، اور ہماری دلچسپی دیکھ کر ہم جو کرنا چاہتے تھے وہ کرنے دیا۔

میرے بڑے بھائی مویئد حسن بہت مشہور فوٹوگرافر تھے۔ انھوں نے ٹی وی کے لئے کئی ڈاکومنٹری فلم بھی بنائی تھی۔ ڈاکٹر افضل محمد امبیڈکر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ احمد جلیس مزاح نگار تھے۔ دوردرشن کے ڈائریکٹر تھے۔ آل انڈیا ریڈیو میں بھی رہے۔ ان کا بنایا ہوا ایک پروگرام ''چھوٹی چھوٹی باتیں'' بہت پسند کیا گیا تھا۔ سارے ہندوستان میں لوگ اس پروگرام کو بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔

میرے چھوٹے بھائی محی الدین حسن بھی بہت مشہور آرٹسٹ ہیں۔ انھیں ادب کا بھی بہت اچھا ذوق ہے۔ ان کی ایک کتاب ''دلی کی بیگماتی زبان'' شائع

ہو چکی ہے۔ باوا ہمیں مشکل شعروں کا مطلب سمجھاتے تھے۔ مذہب، سائنس اور فلسفہ کیا ہے؟ مذہب اسلام کیا ہے؟ اس کے اصول کیا ہیں؟ ہم مسلمان کیوں ہیں؟

ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ لڑکیوں کے زور سے ہنسنے پر بھی پابندی تھی۔ کھڑکی کھول کر باہر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سڑک پر نہیں جا سکتے تھے۔ غیر مردوں سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ رومانی فلموں کے گیت نہیں گا سکتے تھے۔

گھر میں مشاعرے ہوتے تھے، موسیقی کی محفلیں ہوتی تھیں، آج کسی بچے کو اپنے گھر میں کسی مشہور فلم اسٹار کو دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوگی جو ہمیں اپنے گھر میں مشہور ادیبوں، شاعروں اور موسیقاروں کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ سردار جعفری، مخدوم، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، سکندر علی وجد، جگر مراد آبادی۔ کس کس کو یاد کروں؟

آج کل کے بچے اپنے پسندیدہ فن کار کے آٹو گراف لیتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنے بچپن میں جن شاعروں کا کلام سنا تھا، وہ شاعری، ان کی باتیں آج تک یاد ہیں۔

رات کو جب ''بیت بازی'' کا پروگرام ہوتا تھا تو ہم ان شاعروں کے شعر

ان ہی کے ترنم میں ایکٹنگ کے ساتھ سناتے تھے تو سب کو ہنسی آجاتی تھی۔ باوا خود تو کسی سیاسی پارٹی میں شریک نہیں تھے مگر انھیں سیاسی حالات سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ حیدرآباد کے سب ہی ادیبوں، شاعروں، سیاسی لیڈروں کے دوست تھے مگر ترقی پسند ادیبوں کی سرگرمیوں اور ان کے ادبی نظریوں کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے ساتھ تھے، ملاچلی میں اختر حسن کا خاندان ترقی پسند ادیبوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ باجی جمال النساء کی بہن ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ تھیں۔ اختر حسن کی بیگم ریاست خانم اور ان کی بہن شوکت خانم (بیگم کیفی اعظمی) (شبانہ اعظمی کی امی) (کیفی اعظمی کی بیگم بمبئی چلی گئی تھیں) یہ سب ملاچلی میں رہتے تھے۔ ان کے گھر جب ہندوستان کے شاعر، ادیب، آرٹسٹ آتے تھے تو وہاں سے وہ سب ہمارے گھر بھی ضرور آتے تھے۔ باوا کی سب سے ملاقات بھی ہوجاتی اور وہ سب باوا کا بہت احترام بھی کرتے تھے۔

باوا ہمیں سناتے تھے کہ مخدوم اور ان کے ساتھی غریبوں، کسانوں کے لئے کتنا کام کررہے ہیں اور گاؤں میں زمیندار کتنی ناانصافی کرتے ہیں۔

ہم پچھمی کے ساتھ اس کے گاؤں میں جاتے تھے بیل گاڑی میں بیٹھ کر۔ مگر

گاؤں میں پھپھی کے گھر میں چراغ جلتا تھا۔ تیز ہوا چلتی تو بار بار چراغ بجھ جاتے تھے۔ اسی لئے اماں ہمیں گاؤں نہیں جانے دیتی تھیں۔ مگر ہمیں بیل گاڑی میں بیٹھ کر جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ پھپھی کے گاؤں والے جاگیرداروں، زمینداروں کے ظلم وستم کی باتیں سناتے تھے۔

ہم بہن بھائی بیمار ہوتے تھے۔ کسی کو بخار آجاتا، کھانسی ہوتی یا کوئی اور بیماری شروع ہوجاتی تھی تو اماں کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں بھیجتی تھیں۔ زندہ طلسمات، جوشاندہ، چورن کھلا دیتی تھیں۔ یا پھر باوا اپنے دوست حکیم چندر بھان سے کوئی دوا لے آتے تھے۔ اماں کوئی دعا پڑھ کر درد کی جگہ پھونک دیتی تھیں۔ ہمارا درد کم ہوجاتا تھا۔

پھپھی چھوٹے بچوں کی بیماری کے لئے اپنی مٹھی میں نمک مرچ تھام کر تین بار ہمارے سر پر سے وار کے پھینک دیتی تھی کہ اگر بچے کو کسی کی نظر لگ گئی ہے تو اس کا اثر کم ہوجائے گا۔

اماں ہم تینوں بہنوں کی طرف سے بہت پریشان رہتی تھیں۔ ہر وقت دیکھتی رہتی تھیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ لڑکیاں چائے نہیں پیتی ہیں؟ لڑکیاں پان نہیں کھاتی ہیں؟ لڑکیاں زور سے نہیں ہنستی ہیں؟ جہاں مرد بیٹھے ہوں وہاں

لڑکیاں آ کر نہیں بیٹھتی ہیں؟ اماں یہ باتیں ہر وقت کہتی رہتی تھیں۔ مجھے گانا سننے کا شوق تھا۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ لڑکیاں گانا نہیں گاتی ہیں۔

روشن علی چچا جب آتے تھے تو حسن کو راگ، راگنیوں کا سرگم سکھاتے تھے۔ سُر، تال، الاپ، سرگم کے ساتھ سُر کیا ہیں، وہی گراموفون پر کس گانے والے استاد کا کوئی ریکارڈ لگا کر حسن کو سمجھاتے تھے تو میں بھی ان کی باتیں سنا کرتی تھی۔ شاید اسی لئے مجھے مختلف راگوں کے سننے کا جو اثر ہوتا ہے، وہ یاد ہو گیا تھا اور میں مختلف راگوں کے تاثر پر افسانے بھی لکھے تھے۔ ''بھیروئیں کے سُر'' ''کیدارا'' میرے ان افسانوں کو پڑھ کر پاکستان کے مشہور شاعر مختار صدیقی نے مجھے خط لکھا تھا کہ آپ نے ایک راگ کے تاثر پر افسانہ لکھ کر افسانے کی تکنیک کا نیا انداز نکالا ہے۔

موسیقی سننے کا یہ شوق مجھے آج بھی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے صبح سات بجے کلاسیکل گانے کا پروگرام ہوتا تھا۔ ہم یہ پروگرام آج بھی سنتے ہیں۔ آخری گیت کے۔ ایل۔ سہگل کا ہوتا تھا اور اس کا مطلب تھا آٹھ بج گئے، اس لئے حسن، افضل، احمد، پاشا، اپنے بیگ اٹھا کر اسکول کی طرف بھاگتے تھے۔ مجھے اپنے بچپن کی ایک اور بات یاد آ رہی ہے۔ ایک بار میں نے باوا سے پوچھا تھا کہ ''اللہ

میاں سے کچھ مانگنا ہو تو نماز کے بعد دعا کیوں مانگتے ہیں؟ کیا میں اللہ میاں کو خط نہیں لکھ سکتی۔"

"بانو! اللہ میاں کو خط نہیں لکھتے۔ نماز کے بعد دعا مانگو اللہ میاں تمہاری دعا سن لیں گے۔" باوا نے مجھے سمجھایا تو میں نے تعجب سے پوچھا تھا۔

"کیوں! کیا اللہ میاں کو بھی اردو پڑھنا نہیں آتی ہے۔"

میرے اس سوال پر باوا کو ہنسی آ گئی تھی۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو بھی یہ بات سنائی تھی۔

باوا اپنے پلنگ پر تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر فارسی اور اردو کی کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ ہر وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اماں صبح میں بہت سے پان بنا کر پانوں کی ڈبیہ اور بٹوا ان کے پاس رکھوا دیتی تھیں۔ پھر ان کے دوست آ جاتے تھے۔ اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر منان، یونس سلیم، تو پھر باوا دیوان خانے میں چلے جاتے تھے۔ "دیوان خانہ" اس کمرے کو کہتے تھے جہاں مہمان آ کر بیٹھتے ہیں۔

ہم سب کے کھیل، ہماری باتوں سے باوا کو بہت دلچسپی تھی۔ وہ ہمیں مزاحیہ شعر بھی سناتے تھے۔ پہیلیاں سنا کر پوچھتے تھے ان کا مطلب بتاؤ۔ کبھی ہم

سب ضد کرتے تھے تو باوا ہمیں ''باغ عام'' لے جاتے تھے۔ ''باغ عام'' اس پارک کا نام تھا جو اب ''پبلک گارڈن'' ہو گیا ہے۔ وہاں ''زو'' بھی تھا۔ ہمیں ''باغ عام'' جانے کی بڑی خوشی ہوتی تھی وہاں کھیلنے کا بہت بڑا امیدان تھا۔ بچوں کے لئے جھولے تھے۔ طرح طرح کے پھولوں پھلوں کے درخت تھے۔

ہمیں ''زو'' کے جانور دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہر طرح کے خوبصورت پرندے تھے۔ شیر، ببر، ہرن، ریچھ، ہاتھی، بندر، ناچنے والے مور۔

ایک بار ہم ''زو'' کے بندروں والے کونے میں کھڑے تھے وہاں ایک بوڑھی بھکارن کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی کھڑا تھا وہ رو رو کر کہہ رہا تھا کہ مجھے بھوک لگی ہے کھانا دے دو۔ وہ بھکارن سب سے بھیک مانگ رہی تھی۔ پھر ایک آدمی آیا، وہ لوہے کی جالی والا دروازہ کھول کر اندر گیا اور بندروں کو کھانا کھلانے لگا۔

یہ دیکھ کر بھوکا بچہ اپنی دادی سے لپٹ گیا اور رو رو کر کہنے لگا کہ مجھے بھی بندروں کے پنجرے میں ڈال دو۔ میں بندروں کے ساتھ کھانا کھالوں گا۔ باوا نے اس بچے کی دادی کو کچھ روپے دیئے اور ایک کیلے بیچنے والے سے کیلے لے کر اس بچے کو دے دیئے تھے۔

حسن اور افضل کو سائیکل چلانے کا شوق تھا۔ وہ کرائے کی سائیکل لاتے تھے۔ اس کا کرایہ تھا ایک آنہ۔ اور یہ ایک آنہ اماں کی بہت دیر تک خوشامد کرنے کے بعد ملتا تھا۔

دیوان خانے میں باوا ہر وقت دوستوں میں گھرے بیٹھے رہتے تھے اور اماں ان کے لئے بار بار چائے بنانے سے بور ہو جاتی تھیں اور باوا سر جھکائے لکھے جاتے تھے۔

جب کوئی موسم کے پھل بیچنے والا آجاتا تھا۔ مٹھائی اور برف کے لڈو کھانے کو جی چاہتا تھا تو اماں کہتی تھیں اللہ سے مانگو، نماز کے بعد دعا مانگو اللہ میاں تمہاری یہ خواہش پوری کرے گا۔

مگر مجھے تو غصہ آتا تھا کہ اللہ میاں نے سب اچھی اچھی مزیدار چیزیں اپنے پاس کیوں رکھ لی ہیں؟ ہمیں قرآن شریف پڑھانے کے لئے جو مولوی صاحب آتے تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ہر چیز اللہ دیتا ہے۔ جھوٹ مت بولو، چوری مت کرو، کسی کو مت مارو، جو کسی کو مارتا ہے وہ قاتل ہے، اللہ میاں اسے دوزخ میں ڈال دیتے ہیں اور جو اچھے کام کرتے ہیں۔ وہ جنت میں جائیں گے۔ مولوی صاحب کی وہ باتیں مجھے اب بھی یاد ہیں۔

میں یہ سوچتی تھی کہ جب کسی کی جان لینا گناہ ہے تو اماں مرغی کو کاٹ کر اس کا گوشت کیوں پکاتی ہیں۔؟ بقرعید کے دن اتنے بکروں کو کاٹ دیتے ہیں۔ تو کیا بکروں کو مار ڈالنے سے گناہ نہیں ہوتا؟ اماں سے ایسے سوال کرو تو وہ ڈانٹ دیتی تھیں۔ ''ہر وقت الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہو تم؟ جاؤ اب سو جاؤ۔''

مگر میں سوچتی تھی اچھے کام کرنے والے، نماز پڑھنے والے، سب جنت میں رہیں گے، تو پھر اماں، باوا، ماموں جان اور مولوی صاحب سب جنت میں چلے جائیں گے؟ تو پھر کیا ہم سب بچے دوزخ میں جائیں گے؟ ہم جھوٹ بولتے ہیں، ایک دوسرے کو مارتے ہیں، نماز اور قرآن شریف نہیں پڑھتے۔ اماں کے بٹوے میں سے پیسے نکال کر سیتا پھل خرید کر کھا لیتے ہیں۔ تو پھر ہم سب بہن بھائی دوزخ میں جائیں گے؟ پھر تو بڑا مزہ آئے گا، وہاں کوئی کھیل کود سے روکنے والا نہیں ہوگا۔

ایک دن میں نے خالہ سے پوچھا تھا۔

''بلی نے کبوتر کو مار ڈالا ہے تو کیا اب بلی بھی دوزخ میں جائے گی؟''

خالہ کو میرے ایسے سوالوں پر بہت غصہ آتا تھا۔ وہ اماں سے کہتی تھیں۔

''آپا! بانو جانے کون کون سی کتابیں پڑھنے لگی ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ

سوال کرتی رہتی ہے۔''

خالہ کی باتیں سننے کے بعد میں باوا کی شلف میں سے کوئی اور کتاب اٹھا لاتی تھی، حاتم طائی، الف لیلیٰ، شاہد رعنا، مگر مجھے شفیق الرحمٰن، عظیم بیگ چغتائی اور راجہ مہدی علی خاں کی مزاحیہ شاعری پڑھ کر بہت ہنسی آتی تھی۔ ان کتابوں کے کیریکٹر نئی نئی شکل میں نظر آتے تھے۔ ان کہانیوں کے کیریکٹر جو کام نہیں کرتے تھے میں ان سے وہ کام بھی کروا کے سوچتی تھی کہ اب اس کہانی کو میں لکھوں گی تو ایسے لکھوں گی۔ مگر گھر میں اتنا کاغذ کون دیتا کہ فضول باتیں لکھ کر کاغذ پھینک دو۔

ماموں جان اوورسیر تھے۔ وہ جب آفس سے واپس آتے تھے تو اپنے آفس کی پرانی فائلیں پھینک دیتے تھے۔ میں وہ فائلیں ماموں جان سے لے لیتی تھی۔ کیونکہ اس کا ہر ورق ایک طرف سے سادہ ہوتا تھا۔ میں اس سادہ ورق پر کہانی لکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں نے کئی برسوں تک ماموں جان کی پرانی فائلوں پر کہانیاں لکھی تھیں۔ جادو کا پٹارہ، مسکراتا گلاب، ایک دن کی بادشاہت، بچوں کے رسالے ''کھلونا'' اور ''تارے'' کو یہ کہانیاں بھیجی تھیں۔

میرے افسانوں کی کتاب ''روشنی کے مینار'' کے کئی افسانے بھی میں نے

پہلی بار ان ہی ردی کاغذوں پر لکھے تھے۔

پھر جب میرے لکھنے کا شوق بڑھتا گیا اور میں میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی کر رہی تھی تو اماں بھائیوں کے ساتھ مجھے بھی دو آنے والی پچاس صفحے کی کاپی منگوا کر دیتی تھی۔

''روشنی کے مینار'' میں ایک کہانی ہے ''چھٹکارا'' ۔ یہ کہانی میں نے بہت دنوں بعد لکھی تھی جب میں افسانے لکھنے لگی۔ مگر یہ کہانی بچپن سے میرے ساتھ تھی۔

ہمیں پڑھانے کے لئے جو مولوی صاحب آتے تھے وہ بہت غریب آدمی تھے۔ لاٹھی پکڑ کر چلتے تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ ان کی تنخواہ تھی پانچ روپے۔ اماں انھیں فطرے کے گیہوں اور رمضان میں زکوٰۃ کے پیسے بھی دیتی تھیں۔ جب کسی کی دعوت ہوتی تھی اور بہت سا کھانا بچ جاتا تھا تو اماں ہم سے کہتی تھیں یہ کھانا مولوی صاحب کو کھلا دو۔ مولوی صاحب کھانا دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے اور پلیٹ میں جتنی بریانی، مٹھائی، مرغی کا گوشت ہوتا سب کھا لیتے تھے۔ پھر ہم سب کو دعائیں دیتے تھے۔ ایک بار دعوت کی بہت سی کھیر بچ گئی۔ دو دن بعد اماں نے وہ کھیر دیکھی تو مجھ سے کہہ دیا ''یہ کھیر

خراب ہوگئی ہے، مولوی صاحب کومت دینا۔ مگر اس دن مولوی صاحب آئے تو انھیں بہت بھوک لگ رہی تھی۔ مجھ سے پوچھا ''کیا تمہارے گھر آج دعوت ہے؟ تم نے کھانا کھالیا؟ میں نے سوچا مولوی صاحب کو بھوک لگ رہی ہے، میں نے وہ کھیر لاکر مولوی صاحب کو کھلا دی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اماں کو معلوم ہوگا تو مجھے ڈانٹیں گی۔

دوسرے دن مولوی صاحب ہمیں پڑھانے کو نہیں آئے۔ میں گھبرا گئی، شاید وہ کھیر کھانے پر مولوی صاحب بیمار ہوگئے ہیں۔ یہ بات میں برسوں تک نہیں بھول سکی۔ اور برسوں بعد میں نے ایک کہانی لکھی تھی ''چھٹکارا''۔ یہ کہانی میری پہلی کتاب ''روشنی کے مینار'' میں شامل ہے۔ آج بھی جب کسی بھکاری کو باسی روٹی دیتی ہوں تو مجھے مولوی صاحب یاد آتے ہیں۔

اماں نے ہمیں اسکول نہیں بھیجا۔ مگر انھیں ہم تینوں بہنوں کی تعلیم کی بڑی فکر تھی۔ دن رات کہتی تھیں پڑھا کرو، باوا کے ایک دوست ہیں کبھی کبھی آکر انگلش کی کتابیں پڑھا دیتے تھے۔ ہمیں میٹرک کے امتحان کی تیاری کرنا تھی۔ میں باوا کی الماری میں سے کوئی اور کتاب اٹھا کر لے آتی تھی۔ مگر اس الماری کی کتابیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ انگلش، عربی اور فارسی کی کتابیں اور

شاعروں کے دیوان تھے۔ دوسری الماری میں اردو کی کتابیں تھیں۔ وہ اماں کی پسند والی کتابیں تھیں۔ عبدالحلیم شرر کے ناول، الف لیلیٰ کی کہانیاں، پریم چند، حجاب امتیاز، عظیم بیگ چغتائی اور جانے کون کون سی کتابیں تھیں۔ میں ایک کتاب کھول کر بیٹھ جاتی تھی تو خالہ اپنے پاس بلا لیتی تھیں۔ ان کے پلنگ پر خالہ کی ایک طرف میں لیٹ جاتی۔ دوسری طرف مہر لیٹ جاتی تھی۔ خالہ ہمیں اچھی اچھی باتیں سمجھاتی تھیں۔ اللہ۔ رسول۔ مذہب کے بارے میں باتیں کرتی تھیں، جنت اور دوزخ کا حال، گناہ کیا ہے، کون سے اچھے کام ہیں، جن کے کرنے سے ثواب ملتا ہے۔ مگر میں ان سے بار بار سوال کیے جاتی تھی۔ ''اللہ میاں سب کو کھانا دیتے ہیں، مگر بھکاریوں کو کھانا کیوں نہیں دیتے؟'''' وہ فقیر باوا سے کہہ رہا تھا مجھے ایک روپیہ دے دو تو تمہیں اللہ ہزار روپے دے گا۔ اگر اللہ میاں اس کی دعا سن لیتے ہیں تو وہ خود اپنے لئے اللہ میاں سے ہزار روپے کیوں نہیں مانگ لیتا؟'''' اللہ میاں ہر ایک کو دیکھ رہے ہیں کون برے کام کر رہا ہے؟ کون اچھے کام کر رہا ہے؟ اللہ میاں اتنے بہت سے کام کیسے کر لیتے ہیں؟''
میرے ایسے سوالوں پر خالہ کو غصہ آجاتا تھا۔

''چپ رہو۔ اگر تم بار بار ایسے سوال کرو گی تو میں تمہیں کچھ نہیں سناؤں گی۔'' پھر میں ان کے پلنگ سے اتر کر کوئی کتاب پڑھنا شروع کر دیتی تھی۔ مجھے الف لیلیٰ کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ کتاب بند کر کے میں سوچنے لگتی تھی۔

کیا الف لیلیٰ کے جن چلمن میں بیٹھ کر آسمان میں اڑتے تھے۔ ہزاروں میل دور زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کیا فون پر بات کرتے تھے۔ کیا وہ ریموٹ سے بند دروازے کھول دیتے تھے۔ ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی کہانیاں لکھوں۔ مگر الف لیلیٰ کی کہانیوں نے تو آج تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔

ہم سب بہن بھائی کتابیں پڑھیں، گانے گائیں، یا ڈرامے کریں، اماں کو تو ہر وقت ایک ہی فکر رہتی تھی کہ بانو اتنی بڑی ہو گئی ہے اور سوئی میں دھاگہ پرونا بھی نہیں آیا ہے۔ ہم سب کے کپڑے اماں سیتی تھیں۔ اس زمانے میں عورتوں کے کپڑے سینے کے لئے درزی کو نہیں دیئے جاتے تھے۔ اماں باوا کے اور بھائیوں کے کپڑے بھی خود سیتی تھیں، گھر میں کپڑے سینے کی مشین تھی۔ لڑکیوں کو بچپن ہی میں کپڑے سینا سکھایا جاتا تھا۔ اماں نے پہلے ہمیں گڑیوں کے کپڑے سینا سکھایا تھا۔ کروشیے سے بیل بنانا، سوئیٹر بننا بھی سکھایا، اپنی

تراکوں پر، تکیے کے غلاف پر ریشم سے بیل بوٹے بناتے تھے۔

اپنے عید کے ریشمی کپڑوں پر گوٹے کناری اور چمکیوں کا کام بھی اماں نے ہمیں سکھایا تھا، ہم سات آٹھ سال کے ہوں گے جب اماں نے مجھے اور مہر کو اولن سے سوئیٹر بنانا سکھایا، مشین سے اپنے کپڑے سینا سکھایا۔ جلد ہم تینوں بہنیں اپنے کپڑے خود سینے لگیں، اور اپنی سہیلیوں کے رشتے داروں کے کپڑے بھی سینے کا ہمیں شوق تھا۔ میں تو آج بھی اپنے بلاوز، اپنے کپڑے ٹیلر سے نہیں سلواتی ہوں۔ ہم کروشیا سے خوبصورت بیلیں بناتے تھے۔ تکیے کے غلاف پر رنگین ریشم سے پھول بناتے تھے۔

مہر کو پینٹنگ کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بھی ماموں جان کی فائلوں کے سادہ کاغذ پر بہت خوبصورت ڈیزائن بناتی تھی۔ مہر نے اماں، باوا اور ہم سب کے اسکیچ بنائے تھے۔ کمرے کی دیواروں پر لگادیئے تھے اور پھر کمرے کا دروازہ بند کر دیتے تھے۔ اگر اماں کی نظر پڑ جاتی تھی تو وہ مہر کو بہت ڈانٹتی تھیں کہ یہ پینٹنگ کرنے کے بجائے کوئی اچھا کام کیوں نہیں سیکھتی۔ مجھے بھی ڈانٹتی تھیں کہ کورس کی کتابیں پڑھنے کی بجائے کیا لکھا کرتی ہو۔

کمرہ بند کر کے ہم سب ناچ گانے کا پروگرام بھی کرتے تھے، ڈرامے

ایم۔ ایف۔ حسین، جیلانی بانو کے گھر پر

جیلانی بانو سابق صدر کے۔ آر۔ نارائین سے پدم شری ایوارڈ حاصل کرتی ہوئیں

جیلانی بانو

حیدرآباد 1971 عصمت چغتائی کے ساتھ جیلانی بانو

جیلانی بانو اپنے شوہر انور معظم کے ساتھ

جیلانی بانو فیض کے ساتھ (11 اگست 1978)

کرتے، مشہور فلموں کے ایکٹروں کی نقل ہوتی تھی۔ ماموں جان ہم سب کے یہ کھیل دیکھ کر بہت خفا ہوتے تھے۔ اماں سے کہتے تھے:

''آپا! اب تمہارے بچے تو فریدہ اور وسیم کی طرح ناچ گانا سیکھ رہے ہیں، مہر تصویریں بناتی ہے، آخر یہ بچے بڑے ہو کر کیا کریں گے۔ اماں بھی یہ باتیں سن کر گھبرا جاتی تھیں۔ ہمیں کھیلنے سے منع کر دیتی تھیں۔

اماں کھیلنے سے منع کر دیتیں تھیں تو میں الماری میں سے کوئی کتاب اٹھا لاتی تھی۔ الف لیلیٰ کی کہانیاں، حاتم طائی، چہار درویش اور جاسوسی ناول، اماں ایک لائبریری سے منگواتی تھیں۔ لائبریری ملا چلی میں تھی۔ میں ایک کتاب کھول کر کمرے کے کسی کونے میں بیٹھ جاتی تھی۔ مگر الف لیلیٰ کے جن، حاتم طائی کے کردار، جاسوسی ناولوں کے چور قاتل میرا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا حاتم طائی اپنی دولت ان بچوں میں بانٹ دے جو اپنی اندھی ماں کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پر روتے پھرتے ہیں، اور چھوٹا سا بچہ کسی بھی جانے والے کے پیچھے دوڑتا ہے۔ ''او! جانے والے بابو...... ایک پیسہ دے دے۔'' ایک بوڑھا لنگڑا فقیر بھی روز سڑک پر چلاتا پھرتا تھا۔ اماں اسے ایک روٹی دیتی تھیں مگر احمد اماں سے چھپا کر اسے ایک چونی بھی دیتے تھے۔ وہ دروازے پر آ کر زور زور سے احمد کو پکارتا

تھا۔''او گورے بابو...... اچھے بابو...... اس غریب کو دیدے، اللہ تجھے ہزار خوشیاں دے گا۔''

پچھی کہتی تھی وہ لنگڑا فقیر سیندھی پینے کے لئے احمد سے چونی مانگتا ہے۔ اماں کو یہ سن کر غصہ آجاتا تھا۔ مگر احمد پچھی کو سمجھا دیتے تھے۔

''پچھی! تمہیں کھانے کی بھوک لگتی ہے۔ اس فقیر کو سیندھی پینے کی بھوک لگتی ہے اماں سے یہ باتیں کیوں کہتی ہو؟ پھر وہ فقیر کو روٹی بھی نہیں دیں گی۔''

باوا کے دوست آجاتے تھے تو کبھی کبھی شطرنج بھی کھیلی جاتی تھی۔ پان، چائے کے دور چلتے تھے۔ وہ مارو، ہائے ہائے، اب بچ کر کہاں جاؤ گے؟ کبھی ہم بہن بھائی بھی شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے تھے۔ مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ ایک پیادے کو مار کر بادشاہ کیوں جیت جاتا ہے؟ پیادے کی موت پر رونے کے بجائے سب تالیاں کیوں بجاتے ہیں؟ میرے ایسے سوالوں پر باوا کو ہنسی آجاتی تھی۔ میری باتیں وہ اپنے دوست کو بھی سناتے تھے میں تو باوا سے یہ بھی پوچھتی تھی کہ دو ملکوں کے بیچ لڑائی ہوتی ہے تو بادشاہ اپنی فوجوں کو بھیج دیتے ہیں۔ خود کیوں نہیں جاتے؟

باوا میری باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ ہمیں اور کہانیاں سناتے تھے۔

بادشاہوں کے ظلم کے قصے، انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے والے لیڈروں اور ادیبوں کے قصے، یزید، فرعون، ہٹلر کون تھے، انھوں نے عام انسانوں پر کتنا ظلم کیا ہے اور پھر ان کو شکست دینے والے سچے اور اچھے انسان کون تھے۔

ہماری مٹی کی گولک میں جب بہت سے پیسے جمع ہو جاتے تھے تو ہم انھیں نکال کر سب بچوں کے ساتھ گننے کو بیٹھ جاتے تھے۔ اماں اتنے پیسے دیکھ کر کہتی تھیں ''اب تم اتنے بہت سے پیسوں کا کیا کروگی۔ مجھے ادھار دے دو۔ بعد میں واپس کردوں گی۔'' مگر اماں وہ پیسے کبھی واپس نہیں کرتی تھیں۔ بس یہ بہانے کرتی رہتی تھیں کہ تمہارے بادا کی تنخواہ ملے گی تو دے دوں گی۔

کبھی کبھی اماں کی ایک بہت پرانی سہیلی پوشا آنٹی آجاتی تھیں۔ ہمیں پوشا آنٹی کا بہت انتظار رہتا تھا۔ وہ ہمارے لئے دیوالی اور دسہرے کی مٹھائی بھیجتی تھیں اور جب آتی تھیں تو اَپّا اور مٹھائی بنا کر لاتی تھیں۔ پھر اماں کے ساتھ بیٹھ کر سارے محلے کی سارے شہر کی وہ کہانیاں سناتی تھیں جو صرف اماں کو ہی سنانا چاہتی تھیں۔

آج دروازے پر گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو دروازے پر ایک لمبی سی کنڈی لگائی جاتی تھی۔ دونوں کواڑوں کو جوڑ کر زنجیر لگا کر

تالا لگاتے تھے۔ کوئی دروازے پر آتا تو اس زنجیر کو زور سے بجاتا تھا تو اندر آواز
سن کر کوئی دروازہ کھول دیتا تھا۔ پوشا آنٹی کی زوردار گھنٹی کو ہم پہچان جاتے تھے
دوڑتے تھے۔ پوشا آنٹی جب اماں کے پاس بیٹھ کر سارے محلے کی سارے شہر کی
خبریں اماں کو سنا دیتی تھیں تو پھر سب بچوں کو اپنے پاس بلا کر پلنگ پر لیٹ جاتی
تھیں۔ ہم سب ان کے پاس بیٹھ جاتے تھے اور میں ان سے فرمائش کرتی تھی
کہ آج کونسی کہانی سنیں گے۔ ایک بار پوشا آنٹی نے ہمیں کہانی سنائی تھی کہ رام
نے سیتا کے آگے تین لکیریں کھینچ دی تھیں کہ اس کے آگے قدم بڑھاؤ گی تو تم پر
کوئی آفت آجائے گی مگر سیتا راون کے بہکائے میں آگئی۔ انھوں نے تینوں
لکیروں کو روندھ ڈالا تو راون کے ساتھ انھوں نے زندگی بھر کتنے دکھ اٹھائے۔

پھر جب ہم بہن بھائی مل کر کہانیاں سناتے تھے تو ایک بار میں نے رام اور
سیتا کی کہانی سنائی تھی میری کہانی میں سیتا ان لکیروں کو پار کر کے آگے نہیں بڑھی
اور راون اسے ڈرانے کے لئے آیا تو سیتا نے ان کی خوب پٹائی کر کے بھگا دیا۔

کہانی سنانے کے بعد میں تو خوشی سے تالیاں بجانے لگی مگر حسن، افضل،
مہر، اس مشہور کہانی کو بدلنے پر تیار نہیں تھے اور میں بھی سیتا پر کوئی آفت لانے کو
تیار نہیں تھی۔ اس کے بعد میں جو کہانی پڑھتی تھی، کسی سے سنتی تھی تو سب خوفناک،

بے ایمان چوروں اور ڈاکوؤں کو خوب سزا دیتی تھی۔

میرا جی چاہتا تھا میں ایسی کہانی لکھوں کہ دنیا کے سارے بھوتوں شیطانوں کو ایک چلمن میں بیٹھا کر سمندر میں پھینک دوں اور پھر میں ایک ایسی خالہ بی بی کی کہانی لکھوں جو سب لڑکیوں سے کہے گی جاؤ...... جہاں جی چاہے کھیلو، خوب زور زور سے ہنسو، گیت گاؤ، سر پر سے ڈوپٹہ اتار دو اور جو کتاب پڑھنا چاہتی ہو وہ پڑھ سکتی ہو۔

ماموں جان کہتے تھے ہوٹل میں بریانی کی پلیٹ پانچ آنے میں ملتی ہے اور ایک کپ چائے ایک آنے میں، ہمیں گڑیوں کا کھیل بہت پسند تھا، اس لئے اتنی مہنگی چیزیں خرید کر کھانے کا خیال بھی نہ آتا تھا اماں ہمیں ہاتھوں سے کپڑے کی گڑیاں بنا دیتی تھیں، اور پھر ان گڑیوں کے کپڑے ہم سے سلواتی تھیں۔ ہمیں اپنے کپڑے کا کام ان گڑیوں کے کپڑوں سے آیا تھا۔ اماں ہمیں کپڑوں پر ریشم سے گل بوٹے بنانا بھی سکھاتی تھیں۔ کروشیا سے بیل بنانا سوئیٹر بنانا بھی سکھایا۔

ہماری گڑیوں کا پورا خاندان تھا، ہماری جو سہیلیاں تھیں فریدہ، للّی، ٹونی، بالا، زبیدہ، سب کی گڑیوں کے نام بھی تھے۔ افضل اور احمد پلاسٹک کے خالی ڈبوں سے ان گڑیوں کے گھر بھی بنا دیتے تھے۔

حیدرآباد میں ہر سال ایک بڑی صنعتی نمائش ہوتی ہے جب یہ نمائش شروع ہوتی تھی ڈھولک بجا کر گیت گائے جاتے تھے، للی، ٹونی کا ڈانس ہوتا اور فریدہ، مہر کے گیت سننے کے لئے سارے محلے کے لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔

آیا ہنا آیا، ہریلا ہنا آیا
میں تو نظر کے ڈر سے دیکھی نہ آنکھ بھر کے
اپنی بنی لے چلے سردار ہو
دلہن کی اماں یوں بولے اب ہو گے لاچار ہو
ٹین کے خالی ڈبوں پر ڈھول بجایا جاتا تھا۔

ہر سال جنوری میں ایک مہینے تک نمائش ہوتی تھی۔ اس نمائش میں کشمیر، دہلی، بنارس، اورنگ آباد، بنگال، ہر شہر کے مخصوص کپڑے اور وہاں کی ہر طرح کی چیزوں کے اسٹال سجائے جاتے تھے۔ نمائش ایک ایک مہینے تک ہوتی تھی۔ ایک دن ''لیڈیز ڈے'' ہوتا تھا۔ اس دن مردوں کا داخلہ بند ہو جاتا تھا۔ دوکانوں پر سامان بیچنے والی بھی عورتیں ہی ہوتی تھیں۔ عورتوں کو نمائش کے ''لیڈیز ڈے'' کا بہت انتظار ہوتا تھا۔ کیونکہ گھریلو خواتین بازاروں میں نہیں جاتی تھیں اور نہ انھیں اپنی پسند کی چیزیں خریدنے کا موقعہ ملتا تھا۔

اس نمائش کا ٹکٹ تھا چار آنے اور پھر آنے جانے کا تانگے کا خرچ۔ اس لئے نمائش میں خرچ کرنے کے لئے ہم سب سال بھر تک پیسے جمع کرتے تھے۔ اپنے اچھے کپڑے نمائش جاتے وقت پہننے کے لئے رکھ دیتے تھے۔ ہماری جو سہیلیاں تھیں وہ ہمیشہ نئے نئے کپڑے پہنتی تھیں۔ نمائش سے طرح طرح کے کھلونے، گڑیاں، کپڑے خرید کر لاتی تھیں، اور ہمیں دکھاتی تھیں، جب ہم اماں سے کہتے تھے کہ آپ ہمیں کیوں نہیں بہت سے پیسے دیتی ہیں۔ تو سارا غصہ باوا پر آتا تھا اماں کو۔ ''تمہارے باوا کو تو شاعری کرنے اور کتابیں لکھنے سے فرصت ہی نہیں ملتی ایک تنخواہ میں سارے گھر کا خرچ کیسے کروں؟''

اماں کی اس پریشانی اور شکایتوں کا حال برسوں بعد ہمیں باوا نے سنایا تھا کہ وہ کونسا زمانہ تھا جب حیدرآباد کے عوام معاشی اور سیاسی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد حیدرآباد میں سیاسی پارٹیوں کے علاوہ ادیبوں کے بھی دو گروپ ہو گئے تھے ایک گروپ کے لوگ چاہتے تھے حیدرآباد ایک آزاد ریاست رہے۔ دوسرا گروپ چاہتا تھا کہ حیدرآباد کو انڈین یونین میں شامل ہو جانا چاہیے تاکہ جاگیردارانہ نظام ختم ہو جائے، اور اس طرح ادیبوں کے الگ الگ گروپ بن گئے تھے۔ بہت سے ترقی پسند ادیب ملاچلی میں رہتے تھے۔ اس

لئے اکثر یہ ادیب ہمارے گھر آجاتے تھے اور یہیں ان کی میٹنگ ہوا کرتی تھی۔

باوا عملی طور پر ان ادیبوں کے ساتھ نہیں تھے لیکن ترقی پسند ادیبوں کے اصولوں اور ان کی سیاسی جدوجہد کو پسند کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تلنگانہ تحریک عروج پر تھی۔

جاگیرداروں اور زمینداروں کے خلاف کسانوں اور مزدوروں کی بغاوت اس تحریک کا مقصد تھا انھوں نے زمینداروں، جاگیرداروں سے زمین چھین کر زمین کسانوں میں تقسیم کردی تھی۔ جاگیرداروں، زمینداروں کی ناانصافی کے خلاف احتجاج بھی کررہے تھے۔ نظام کی فوج نے اس تحریک کو ختم کرنا چاہا۔ گاؤں میں پولیس اور فوج آگئی تھی۔ حیدرآباد کے ادیب اور شاعر، آرٹسٹ بھی عوام پر ہونے والے ظلم کے خلاف لکھ رہے تھے مخدوم روپوش ہوگئے تھے۔ مگر وہ اکثر راتوں کو چھپ کر ہمارے گھر آتے تھے۔ اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتے تھے۔

ملازمت کے علاوہ باوا کا سارا وقت ان ادیبوں کے ساتھ ان کی سرگرمیوں کو دیکھنے میں گزرتا تھا، نیاز حیدر، سری نواس لاہوئی، یونس سلیم، راج بہادر گوڑ، محبوب حسن جگر۔

باوا ہمیں انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کی پوری تاریخ کے قصے سناتے تھے۔ اور پھر ہندوستان کو برٹش گورنمنٹ کے جبر سے آزاد کرانے کی باتیں، لیڈروں نے اس کے لئے کیا کام کیے، ان کی قربانی کے قصے، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، ابوالکلام آزاد، بھگت سنگھ۔

پھر ادب کی باتیں ہوتیں۔ شعر کی خصوصیت، کلاسیکل سنگیت کے سروتال، اپنے مذہب کے بارے میں سارے احکام، قرآن اور حدیث کی اہمیت سمجھائی۔ یہ ساری باتیں باوا ہمیں سبق کی طرح نہیں سمجھاتے تھے۔ دلچسپ کہانی کے انداز میں کسی موقعہ پر کسی بات پر کہہ دیتے تھے اور پھر ان باتوں کے بارے میں ہم سے سوال کرتے تھے کہ بتاؤ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟ یہ ریڈیو پر جو گانا ہورہا ہے وہ کونسا راگ ہے؟ شعر کی ردیف، قافیہ، بحر کیا ہوتی ہے؟

ایک بار میں نے کسی افسانے میں لکھا تھا ''وہ سیتا کی طرح چتر تھی۔''

تو باوا نے پوچھا تھا کہ سیتا کون تھی؟ پہلے سیتا کی کہانی پڑھو، الف لیلیٰ پڑھو، اچھے شعر کا مطلب کیا ہے؟ اسلام کیا ہے؟ ہندو مذہب کیا ہے؟ عیسائی کون ہیں؟ وہ ہمیں ان سارے مسائل کے بارے میں سمجھاتے تھے۔ مگر سبق کی طرح نہیں پڑھاتے تھے۔

رات کو بیت بازی کا پروگرام ہوتا تھا۔ اچھا شعر پڑھنے پر انعام ملتا، غلط شعر پڑھنے پر جرمانہ ہوتا تھا۔

پھر میں نے بچوں کے رسالوں میں کہانیاں لکھنا شروع کیا۔ کھلونا، تارے، میں کہانیاں چھپی تھیں۔ میں نے اردو شاعروں کو پڑھا، مگر میں الف لیلیٰ، باغ و بہار، طلسم ہوش رُبا، کتابیں تھیں، گورکی ،ٹالسٹائے، عظیم بیگ، عصمت چغتائی، حجاب امتیاز کی کتابیں بھی تھیں۔ کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، اور بہت سے افسانہ نگاروں کی کتابیں تھیں جو کبھی کبھی میری سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں۔ مگر میں نے ان کتابوں سے کہانی سنانے کا ڈھنگ سیکھا تھا۔ موضوع کا انتخاب اور کسی واقعہ کو کہانی بنادی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے مجھے آج بھی کہانی کی پہلی سطر سب سے اہم لگتی ہے اور میں اس کی تلاش میں رہتی ہوں۔

کبھی کبھی اخبار میں کوئی پریشانی کی خبر بھی آجاتی تھی، پاکستان ہندوستان کے کسی شہر میں فساد ہورہا ہے۔ اتنے لوگ مرگئے، اتنے بے گھر لوگ اپنا سامان اپنے سر پر رکھے بچوں کا ہاتھ پکڑے جانے کہاں جارہے ہیں۔ باوا ان خبروں سے پریشان ہوجاتے تھے۔

میں بھی اپنے کورس کی کتاب رکھ کر اخبار کی نیوز پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔ باوا

بھی چاروں طرف پھیلے ہوئے سیاسی حالات سے پریشان رہتے تھے وہ مجھ سے بھی کہتے تھے کہ تم بس اپنے کورس کی کتابیں پڑھو۔ امتحان کی تیاری کرو۔ افضل، حسن اور احمد تو اسکول جاتے تھے۔ میں میٹرک کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ کتابیں تو میں خود پڑھ لیتی تھی مگر جغرافیہ کی کتاب میں ساری دنیا کے الگ الگ ملکوں کے نام اور ان کے الگ الگ نقشے بنانا مجھے نہیں آتا تھا۔ میں عبارت کا نقشہ بناتی تھی تو اس میں کبھی بنگلہ دیش کو جوڑ دیتی تھی کبھی پاکستان کو الگ الگ کرنا بھول جاتی تھی۔ باوا میری کاپی دیکھ کر ہنستے تھے۔

''خوب تم نے تو ہندوستان اور پاکستان کو جوڑ دیا ہے۔''

''تو پھر الگ الگ کیسے کروں......؟''

میرے اس سوال پر باوا کو ہنسی آ گئی تھی۔

''بانو بی بی...... یہ بات تو سیاسی لیڈر بھی نہیں کر سکے ہیں۔ چلو تم وہ نو ملکوں کے الگ الگ نقشے بنا کر لکھ دو۔ ہم سب ایک ہیں۔ ایک رہیں گے۔''

مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، مہر کو پینٹنگ کرنے کا اور فلمی گیت گانے کا۔ ہم دونوں کمرے میں ایک دری بچھا کر بیٹھے رہتے تھے۔ ہم دونوں ایک رکابی میں ساتھ ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ ایک جیسے کپڑے پہنتے تھے۔ ہر جگہ ساتھ ساتھ

جاتے تھے، مجھے بخار آتا تھا، مگر میں دوا نہ پینے کی ضد کرتی تھی اور خوب روتی تھی۔ اماں میرے ہاتھ پکڑ کر زبردستی دوا منہ میں ڈالتی تھیں تو میرے ساتھ مہر بھی رونے لگتی تھی۔ حسن یا افضل مہر سے پوچھتے تھے ''تم کیوں رو رہی ہو۔'' تو مہر اپنے آنسو پونچھ کر کہتی تھی ''بانو رو رہی ہے تو مجھے بھی رونا آ رہا ہے۔'' میں نے میٹرک کا امتحان بھی نہیں دیا تھا مگر میں نے گورکی کی کتاب ''ماں'' کا اردو ترجمہ عصمت چغتائی، کرشن چندر، فیض، مخدوم، میرامن، ٹیگور اور مشہور لیڈروں، شاعروں کی آپ بیتی پڑھتی رہتی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جن شاعروں، ادیبوں، لیڈروں نے حصہ لیا تھا ان کے قصے سنتی تھی۔ یہ وہ ادیب تھے جنھوں نے مجھے لکھنے کا شوق دلایا تھا۔

جھوٹ، ناانصافی اور ظلم کے خلاف ایک ادیب کو لکھنا چاہیے، وہ جیسے مجھ سے کہہ رہے تھے اپنے چاروں طرف دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ وہ زمانہ تھا جب حیدرآباد ایک بہت بڑے سیاسی ہنگامے سے گزر چکا تھا اس لئے حیدرآباد کا جاگیرداری دور ختم ہو چکا تھا۔ بڑی بڑی ڈیوڑھیوں میں رہنے والوں کی شان شوکت باقی نہیں رہی تھی۔

حیدرآباد کے اس سیاسی توڑ پھوڑ کے بعد یہاں کے ترقی پسند ادیبوں نے

بھی سیاسی لیڈروں کے ساتھ حق اور انصاف کے لئے اپنی جدوجہد تیز کردی تھی۔ حیدر آباد کی سیاست اور یہاں کی تہذیب یہاں کا معاشرہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے الگ تھا۔ جاگیرداری تہذیب اور کلچر کی روایتیں باقی تھیں اور نئے تہذیبی اور سیاسی مسائل کو لے کر عوام بیدار ہو رہے تھے۔ جاگیرداری سیاست کوختم کر کے نئے سیاسی نظام کی طرف بڑھنے والے ادیبوں اور لیڈروں کے لئے یہ راہ آسان نہیں تھی میں نے یہ دور خود نہیں دیکھا۔ لیکن سنا ہے کہ اورینٹل ہوٹل، عزیزیا ہوٹل اور بیچلر کوارٹر کے روم نمبر 17، ادیبوں اور سیاسی لیڈروں کا ٹھکانہ بن گئے تھے۔ یہاں ایک آنے میں ایک کپ چائے کے لئے بھی سب شاعر اور لیڈر ایک دوسرے کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے تھے، اور سلیمان اریب جب گھر جانے کے لئے ہوٹل سے باہر آکر کسی رکشا والے سے پوچھتے تھے۔ ''کرایہ کرو گے؟'' رکشا والے نے پوچھا ''آپ کو کہاں جانا ہے صاحب!'' سلیمان اریب نے اپنی جیب کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد کہا ''میرے پاس آٹھ آنے ہیں۔ آٹھ میں جہاں تک جاسکتے ہو وہاں مجھے چھوڑ دو۔'' ادیبوں کی یہ باتیں باوا ہمیں سناتے تھے۔

مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہوا تو باوا نے کہا ''تم صرف کورس کی کتابیں پڑھتی

ہو؟ دوسری کتابیں بھی پڑھا کرو۔'' انھوں نے اقبال، غالب، مخدوم کا کلام اور بہت سے شاعروں کے اشعار کا مطلب سمجھایا۔ شعر کی خوبیاں بھی سمجھاتے تھے۔ حسرت موہانی، بہادر شاہ ظفر کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے برٹش گورنمنٹ کے کتنے ظلم برداشت کئے تھے۔

پھر شعر کا وزن، قافیہ، ردیف کا مطلب سمجھایا۔ وہ مجھے سمجھاتے تھے کہ ایک ادیب یا شاعر کو تمام مسائل سمجھنا پڑتا ہے۔ باوا نے ہمیں بتایا کہ مذہب کیا ہے؟ ہر مذہب کے الگ الگ اصول ہیں۔ اسلام کیسا مذہب ہے؟ ہم مسلمان کیوں ہیں؟ باوا یہ باتیں ہمیں سبق کی طرح نہیں پڑھاتے تھے۔ بلکہ اٹھتے بیٹھتے سمجھا دیتے تھے۔ انھوں نے ہمیں یہ کہانی بھی سنائی تھی کہ انگریز ہندوستان میں کیوں آئے تھے اور ان سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے لیڈروں نے کتنے دکھ جھیلے ہیں۔

ان مسائل پر باوا مشہور شاعروں کے شعر بھی سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا تھا انگریزوں سے اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے صرف سیاسی لیڈر ہی نہیں لڑتے تھے بلکہ ہندوستان کی ہر زبان کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس کے خلاف لکھا تھا۔ انھیں بھی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ وہ ادیب کالے

پانی کی جیل میں رہے، حسرت موہانی کو جیل میں چکی پیسنا پڑتی تھی ان کا شعر ہے:

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی　　یک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

بہادر شاہ ظفر ایک بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ جب برٹش گورنمنٹ نے انھیں کالے پانی کی سزا دے کر ہندوستان سے باہر بھیج دیا تھا تو انھوں نے یہ شعر لکھا تھا جب انھیں موت کی سزا دی گئی تھی:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے　　دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

اور پھر اقبال نے جو کہا وہ ہندوستان کا قومی ترانہ بن کر ساری دنیا میں گونج رہا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

رات کو پچھی ہمیں رادھا اور کرشن کی کہانی سناتی تھی۔ وہ کہانی آج بھی مجھے یاد ہے۔ پانڈ وا ور کورو بھائیوں میں لڑائی ہوئی تو کرشن نے ارجن کا رتھ چلایا تھا۔ پھر مہابھارت کی لڑائی شروع ہوگئی تو کرشن نے ارجن کو جو باتیں سمجھائیں تھیں، وہ بھگوت گیتا میں ہیں۔

کرشن، ارجن، گیتا اور سیتا کی بے شمار کہانیاں پچھی سناتی تھی۔ وہ کہتی تھی

گاؤں میں مندر کا پجاری سب بچوں کو بیٹھا کر یہ کہانیاں سناتا ہے۔ کسانوں پر ظلم کرنے والے جاگیرداروں، زمینداروں کی کہانیاں میں کبھی نہ بھول سکی۔ میں نے برسوں بعد خود گاؤں میں ہونے والے اس ظلم کو دیکھا تھا اور ''بارش سنگ'' ناول لکھا تھا، یہ ناول کا ہندی، انگلش، مراٹھی اور ملیالم میں ترجمہ ہو چکا ہے اور میری اسی کہانی پر ایک کہانی ''نرسیا کی باوڑی'' پر شیام بینگل نے ''ول ڈن ابا'' فلم بنائی تھی۔

ہمارے گھر کے پاس ایک ڈاکٹر کا بہت بڑا مکان بن رہا تھا۔ بہت سے مزدور کام کر رہے تھے، گاؤں سے پتھر توڑنے والے وڈر مزدور آگے تھے تلگو میں وڈر اس مزدور کو کہتے ہیں جو پتھر توڑتا ہے۔ اس وقت پتھر توڑنے کی مشین نہیں تھی۔ کلہاڑی سے پتھر توڑتے تھے۔ وڈر عورتیں چولی نہیں پہنتی تھیں۔ سارے بدن کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ مرد بھی قمیض نہیں پہنتے تھے۔ صرف دھوتی باندھ لیتے تھے۔ چپل بھی نہیں پہنتے تھے۔ وہ عورتیں شام کو بچھی کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھیں۔

جو بلڈنگ بن رہی ہے اس کے نیچے بوریا بچھا کر وہ سب سو جاتے تھے، اینٹوں کے ڈھیر کے پاس پتھروں سے چولہا بنا کر اپنا کھانا پکا لیتے تھے۔ ان کو

مزدوری کے پانچ روپے روز ملتے تھے کسی بڑے پیڑ سے رسی باندھ کر بچے کا جھولا بنا کر چھوٹے بچے کو اس میں سلا دیتے تھے۔ جب وہ بلڈنگ بن جاتی تھی تو بلڈنگ کا مالک انھیں وہاں سے ہٹا دیتا تھا۔ وہ اپنا سامان ٹوکرے میں بھر کے بچوں کا ہاتھ پکڑ کر کسی اور مزدوری کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ اب پھپھی کے پاس جو وڈر عورتیں بیٹھی رو رہی تھیں تو ہم بھی وہاں چلے گئے تھے کہ جانے کیا ہوا ہے؟ مہر، فریدہ، میں اور للی گھبرا گئے کہ شاید کسی مزدور عورت کا وہ بچہ تو نہیں گر گیا ہے۔ جسے وہ ایک اونچے پیڑ کی ڈالی میں ایک رسی باندھ کر اس پر ایک تخت لگا کر لیٹا دیتی تھی۔

مگر پھپھی نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کا مکان بن گیا ہے۔ اب وہ نئے مکان کی خوشی میں دعوت کرنے والے ہیں۔ اس لئے سب مزدوروں سے کہہ دیا ہے کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔

مگر ان مزدوروں کو اب کوئی اور کام نہیں مل رہا ہے۔ کیونکہ بارش ہو رہی ہے اس لئے نئی بلڈنگ بنانے کا کام دو چار مہینے تک نہیں ہوتا تھا۔

پھپھی کہتی تھی ان لوگوں کے گاؤں میں بھی کھیت ہیں نہ گھر ہیں۔ زمیندار انھیں قرض دے کر مفت میں کام لیتا ہے۔ اس لئے وہ شہر میں مزدوری کرنے

آجاتے ہیں۔ ان جھونپڑیوں میں اس وقت ڈرینج سسٹم بھی نہیں تھا۔ ٹائلیٹ کی گندگی اٹھانے کے لئے مہترانی آتی تھی جو گندگی ایک بالٹی میں ڈال کر لے جاتی تھی تو سب دور ہٹ جاتے تھے کہ کہیں مہترانی ہمیں نہ چھو لے، مہترانی ٹائلیٹ کی گندگی اٹھاتی تھی، موریاں صاف کرتی تھی، آنگن میں جھاڑو بھی دیتی تھی، ہمارے گھروں میں ڈرینج سسٹم تھا، مگر مہترانی صفائی کرنے آتی تھی۔ کبھی اس کا چھوٹا بچہ روتا تھا تو اماں روٹی پر سالن رکھ کر ایک کاغذ میں لپیٹ کر دیتی تھیں۔ مہترانی کو اپنے گھر کے برتن نہیں چھونے دیتے تھے۔ ان کے بچے جلدی سے آکر پھلوں کے چھلکے باسی روٹیاں اور آئس کریم کے خالی کون چاٹتے تھے۔ اسی لئے اماں ہمیں ان بچوں کے ساتھ نہیں کھیلنے دیتی تھیں۔

پھپھی اور محلے میں کام کرنے والی عورتیں لڑکیاں، سب شام کو آنگن میں آکر بیٹھ جاتی تھیں۔ پھر اپنے اپنے مسائل پر باتیں ہوتیں، ایک دوسرے سے شکایتیں بھی کرتی تھیں۔ گیت بھی گاتی تھیں۔

کبھی کبھی وہ اماں کے پلنگ کے پاس آکر بیٹھ جاتیں تو پورے محلے کی خبریں سنائی جاتی تھیں۔

ہمارے محلے میں ایک ٹیچر رہتی تھیں۔ وہ کسی اسکول میں کام کرتی تھیں۔

انھوں نے ایک لڑکی پال لی تھی۔ اس کا نام تھا چاند پاشا۔ وہ سچ مچ چاند کی طرح خوبصورت تھی۔ وہ ٹیچر اور ان کی بیٹی محلے میں کسی سے نہیں ملتے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ مگر ان کے ملنے والے مرد آتے جاتے تھے۔ ہمیں چاند بہت اچھی لگتی تھی۔ جب کسی کے ساتھ رکشا یا کار میں کہیں جانے کے لئے آتی تھی تو ہم سب کو اشارے سے بلاتی تھی۔ مگر اماں کہتی تھیں چاند اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اسے اپنے گھر بھی مت بلایا کرو۔

ایک دن سویرے محلے میں بہت شور مچا، سارے محلے کے لوگ چاند کے گھر کے پاس جمع ہو گئے تھے، سنا تھا کہ چاند کو کئی مردوں نے دھوکا دیا تھا۔ اس لئے وہ زہر کھا کر مر گئی، میری خالہ اماں کہہ رہی تھیں "اسے جانے کتنے مردوں نے دھوکہ دیا تھا، اچھا ہوا، مر گئی۔" میں سوچنے لگی جس لڑکی پر اتنا ظلم ہوا تھا تو کیا اس کو مر جانا چاہئے؟ میں اماں سے بار بار پوچھتی تھی کہ اس لڑکی کو دھوکہ دینے والے مردوں کو کیوں نہیں مار ڈالتے؟ اماں غصہ میں آجاتی تھیں۔ "چپ رہو! یہ سب باتیں تمہارے سننے کی نہیں ہیں۔" میں مگر چاند کو نہیں بھول سکی، کئی برس بعد میں نے پہلا افسانہ لکھا تھا۔ "موم کی مریم" اور "ادب لطیف" کو بھیج دیا تھا۔ اپنا ایڈریس اس لئے نہیں لکھا تھا کہ افسانہ واپس آئے گا تو سب مذاق

اڑائیں گے۔

''ادب لطیف'' میں میرا افسانہ شائع ہوا تھا۔ ابھی میں نے میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا۔ باوا میرا افسانہ پڑھ کر بہت خوش ہو گئے تھے مگر ماموں جان بہت خفا ہو گئے تھے۔ اماں سے کہا'' دیکھو یہ لڑکی کیا لکھ رہی ہے؟ ایک رسالے میں رومانی کہانی لکھی ہے اب مردوں کے خط بھی آیا کریں گے بانو کے نام۔''

اماں گھبرا گئیں اور مجھ سے کہا اب ایسی کہانی کبھی مت لکھنا اور مجھ سے پوچھے بغیر کسی رسالے کو مت بھیجنا۔ مگر باوا'' ادب لطیف'' میں میرا افسانہ دیکھ کر خوش ہو گئے تھے کہ اتنے اہم رسالے میں میرا پہلا افسانہ آیا تھا۔ باوا نے مجھ سے کہا تھا کہ رسالے کے ایڈیٹر کو خط لکھو۔ اس کا شکریہ ادا کرو، اور پھر خود بھی مرزا ادیب کو خط لکھا تھا۔

میرے خط کے جواب میں مرزا ادیب صاحب نے ان ادیبوں کی بھی رائے بھیجی تھی جنھوں نے یہ افسانہ پسند کیا تھا۔ یہ کتنے اہم ادیب تھے یہ تو مجھے بہت بعد میں اندازہ ہوا تھا۔ مجھے ''ادب لطیف'' کے اس شمارے میں اپنی کہانی دیکھ کر اس لئے بھی خوشی ہوتی تھی کہ باوا نے بتایا تھا اس شمارے میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور خدیجہ مستور جیسے اہم افسانہ نگاروں کے افسانے تھے۔ میں تو یہ

بھی نہیں جانتی تھی کہ اہم اور اچھے افسانہ نگار کون کون ہیں۔ ترقی پسند تحریک کیا ہے؟ باوا سے سنتی رہتی تھی کہ مخدوم بھی غریبوں، کسانوں مزدوروں کے لئے گاؤں میں جا کر بھی کام کرتے ہیں اور اس کے لئے انھیں کتنی مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پولیس ان کی تلاش میں رہتی تھی۔ مخدوم اور ان کے ساتھی جنگلوں میں چھپتے پھرتے تھے۔ گاؤں میں جاگیردار اور ساہوکار جو غریب کسانوں، مزدوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ ایک بار چھمی کی بہن مالا گاؤں سے آئی تو اس نے بتایا کہ وہ اکیلی پولیس سے دور گاؤں کے ساہوکاروں سے لڑتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا بھائی بھی ہے گاؤں کے جاگیردار اور پولیس ان کی تلاش میں ہے۔

گاؤں والوں کے اس حال پر میں نے ایک افسانہ لکھا، ''روشنی کے مینار'' میرا یہ افسانہ لاہور کے رسالے ''سویرا'' میں آیا تھا۔ مگر حیدرآباد کے ادیبوں کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ ''سویرا'' جیسے اہم رسالے میں علامہ کی لڑکی نے کہانی لکھی ہے۔ وہ نہ گھر سے باہر نکلتی ہے نہ ادیبوں سے ملتی ہے حیدرآباد کے ترقی پسند ادیبوں نے بہت شور مچایا۔ مخدوم سے شکایت کی۔ حیدرآباد کے سب یہی ترقی پسند ادیب باوا کے دوست تھے۔ مخدوم سے تو بہت خلوص تھا۔ ایک بار باوا نے

رات کو مجھے سوتے سے اٹھایا کہ مخدوم آئے ہیں تم سے کچھ کہنے والے ہیں، میں ڈر گئی کہ میں نے جو افسانہ لکھا ہے تو مخدوم بھی اب مجھے ڈانٹیں گے۔ مگر مخدوم نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ

''تم نے 'سویرا' میں بہت اچھا افسانہ لکھا ہے۔ اس عمر میں تم رومانی کہانی لکھنے کے بجائے دنیا میں پھیلی ہوئی ناانصافی اور ظلم کو دیکھ رہی ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ اسی طرح لکھتی رہو۔ جب تمہارے افسانوں کی کتاب چھپے گی تو میں تمہارے سب افسانوں پر ایک مضمون لکھوں گا۔'' اور کئی برسوں کے بعد جب میرے افسانوں کی پہلی کتاب ''روشنی کے مینار'' بھائی احمد ندیم قاسمی نے اپنی نگرانی میں مکتبہ نیا ادارہ لاہور پاکستان کو دی، تو اس کے ڈسٹ کور پر مخدوم صاحب کی رائے بھی شامل تھی۔ انھوں نے مجھے بڑے خلوص کے ساتھ یہ خط لکھا تھا:

جیلانی بانو!

آپ حیدرآباد کے ان نوجوان افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے پردے کی قید و بند کے باوجود زندگی کے نزدیک رہ کر اس کی تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اپنی قابلیت اور تحریروں کے فنِ مضمون نے ہندوستان اور

پاکستان کے ادبی حلقوں میں بہت جلد مقبول بنادیا ہے آپ کو۔ آندھرا کا حیدرآباد بانو کا حیدرآباد ہے جو بانو کا وطن ہے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد تاریخی معرکوں کا مرکز رہاہے۔ قدیم مطلق العنان نظام شاہی اور عوامی جمہوری طاقتوں کی کشمکش۔ جس نے تلنگانہ جدوجہد کی شکل اختیار کی ہے۔ نئے ہیرو، نئے نئے ویلن پیدا کئے ہیں۔ یہ دور بے انتہا ہمت افزاء، دلکش اور بے حد پیچیدہ ہے یہ ایک مورخ، ایک افسانہ نگار کو جاننے سمجھنے اور کہنے کے لئے واقعات اور اچھے برے کرداروں کا بے بایاں ذخیرہ فراہم کرتا ہے۔

بانو! آپ وہ اکیلی لکھنے والی ہیں جس نے حیدرآباد کی اس زندگی اور ماحول سے چشم پوشی نہیں کی۔ آزادی کے بعد اس دور کے جدوجہد میں پیدا ہو کر پر ان چڑھنے والی بانو جو کچھ اس بارے میں دیکھ رہی ہے، سن رہی ہے، شکست احساس کے ساتھ لکیریں بنا کر دنیا کو اس کی تصویر بھی دے رہی ہے۔ ان تحریروں میں مرتے ہوئے سماج کی کراہ اور نومولود جمہوری نظام کی غوں غوں کی میٹھی آواز ہمیں سنائی دے رہی ہے۔

مخدوم

21-06-1959

مخدوم صاحب کی یہ واحد تحریر ہے جو انھوں نے کسی افسانہ نگار کی تعریف میں لکھی ہے اور میری بھی یہ ایک ہی کتاب ہے جس میں کسی ادیب یا نقاد کی رائے شامل ہے۔ وہ اکثر سیاسی یا ادبی مسائل پر بات کرنے کے لئے آتے تھے۔ مخدوم باوا کے دوست تھے۔ راج بہادر گوڑ، اختر حسن، سری نواس لاہوٹی، اور دوسرے دوستوں کے ساتھ آتے تھے تو اماں خاص طور پر ان کے لئے قورمہ اور پلاؤ پکاتی تھیں۔ یو۔ پی کے یہ کھانے انھیں بہت پسند تھے۔

پھر مخدوم صاحب نے ہمارے لئے ایک بہت اہم کام کیا جو شاید انھوں نے اپنے بچوں کے لئے بھی نہ کیا ہو۔ انھوں نے انور کے لئے میرا انتخاب کیا۔ مخدوم صاحب کی پوری دلچسپی اور توجہ کے بعد ہی یہ رشتہ طے ہوا تھا۔ مخدوم انور کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی شاعری اور ادبی سرگرمیوں سے بھی واقف تھے اور شخصی طور پر بھی انور کو بہت چاہتے تھے۔ ہمارے گھر کی ادبی فضا سے اور باوا کے ادبی علمی کاموں سے انھیں بھی دلچسپی تھی۔

حیدرآباد کے سب ہی نوجوان ادیب اور شاعر مخدوم کو گھیرے رہتے تھے، میں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پرائیویٹ دیا تھا، اور میرے لکھنے کا شوق بھی آگے چلنے والا نہیں تھا، کیونکہ بی اے کی تیاری کرنا تھی، مگر انور نے میرا ہاتھ تھام لیا اور

بانو کو جیلانی بانو بنادیا، اس وقت انور معظم کی شاعری کا چرچا ہر طرف تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں کے وہ ایک مقبول شاعر تھے۔ انور نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ ہماری شادی ہوئی تو انور علی گڑھ میں تھے۔

علی گڑھ کی علمی اور ادبی فضا میں ان کی شاعری اور شخصیت دونوں گھل مل رہی تھی۔ 1964ء تک ہم علی گڑھ میں رہے انور وہاں ڈاکٹریٹ کررہے تھے۔ یونیورسٹی میں کام بھی کرتے تھے۔ میں علی گڑھ کے ان دنوں کو کبھی نہیں بول سکتی جہاں میں نے ان اہم ادیبوں، شاعروں کو دیکھا تھا۔ انور ان سارے ادیبوں سے ملتے تھے۔ وہ سب بھی ہم دونوں کو بہت چاہتے تھے۔ اسلوب احمد انصاری، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، معین احسن جذبی، مجیب الرحمٰن، خورشید الاسلام، مجنوں گورکھپوری، محمد حسن، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی عبدالستار، کس کس کو یاد کروں؟

علی گڑھ کا ایک مخصوص انداز تھا، ایک مخصوص تہذیب تھی۔ انور نے علی گڑھ کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز میں کام کیا۔ انجمن ترقی اردو میں بھی کام کیا مگر علی گڑھ یونیورسٹی اور وہاں کی ادبی سیاست سے گھبرا کر انور حیدر آباد آگئے

اور عثمانیہ یونیورسٹی کے اسلامک اسٹیڈیز کے صدر رہو گئے۔

اپنے دوسرے علمی کاموں میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ اب وہ ایک اہم پروجیکٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔ یہاں اردو کتابوں کی کٹ لاگینگ اور کتابوں کی اشاریہ سازی کا کام ہوتا ہے۔ یہ کام پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔

اب انور کی ایک بہت اہم کتاب آئی ہے جو اردو ادب کی ایک اہم کتاب ہے۔ وضاحتی اردو کتابیات (سماجی علوم) یہ کتاب انگلش اور اردو میں چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اب جنوبی ایشیاء کے تمام معاشی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کا کام ایک جگہ مل جاتا ہے اس کتاب کو ہندوستان، پاکستان، یورپ اور ہر جگہ پسند کیا جا رہا ہے جہاں اردو ادب اور دوسرے اہم مسائل پر ریسرچ کا کام ہوتا ہے۔

انور لندن، روس، امریکہ، پاکستان اور سعودی عرب کے مختلف شہروں کے سیمناروں میں شرکت کر چکے ہیں، اب غالب اور ابوالکلام آزاد کے بارے میں دو کتابیں لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس مصروفیت میں وہ شاعری کرنا بھول گئے ہیں۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا، انور تو پہلے ایک اچھے شاعر ہیں، نقاد اور محقق تو بعد میں

ہو گئے۔ میں نے ان کے ایک شعر کو موضوع بنا کر "ایوان غزل" ناول لکھا تھا۔

یہ غزل کی انجمن سے ذرا اہتمام کرلو   کسی غم کو مئے بنالو، کسی دل کو جام کرلو

ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں تو انور معظم شاعر ہی تھے اور آج بھی پاکستان اور علی گڑھ کے دوست آتے ہیں تو علی گڑھ کی وہ ادبی فضا علی گڑھ کے دوستوں کا خلوص یاد آتا ہے۔ مجنوں صاحب، محمد حسن صاحب، اسلوب صاحب، قاضی عبدالستار صاحب، سب دودھ پور کے آس پاس ہی رہتے تھے، انور کے ساتھ علمی ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ پھر میں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ اور جامعہ ملیہ دہلی سے ایم اے کیا۔ آگے ریسرچ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مگر کشمیر میں ایک خاتون نے میرے افسانوں، ناولوں پر ریسرچ شروع کردی تھی۔ تنقید اور تعریف، ہر جگہ علی گڑھ نظر آجاتا تھا۔

ان ادیبوں اور شاعروں کا خلوص اور مخصوص انداز میں بھول نہیں سکی۔ انور ریسرچ کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کر رہے تھے وہاں۔ زینت ساجدہ کو انور کی شاعری بہت پسند تھی، وہ شکایت کرتی تھیں کہ انور حیدرآباد چھوڑ کر علی گڑھ کیوں چلے گئے ہیں؟

میں نے اپنی شادی کا کارڈ عصمت چغتائی کو بھیجا تھا تو انھوں نے مجھے لکھا

تھا۔

''شادی کے بعد یہ مت سمجھ لینا کی منزل آ گئی ہے۔ اپنے قلم کا بھی اتنا ہی احترام کرو جتنا اپنے میاں، اپنے خاندان کا کروگی۔''

یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک ادب میں بس گئی تھی۔ لوگ ادب میں جمود ہو جانے کی باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت سجاد ظہیر نے سلیمان اریب کے رسالے ''صبا'' میں ایک خط لکھا تھا:

''ادب میں جمود کہاں ہے؟ اچھے نئے لکھنے والے سامنے آ رہے ہیں تم لوگ جیلانی بانوں کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔؟''

مجھے اہم ادیبوں کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے میں علی گڑھ میں انور کے دوستوں کے سامنے آ کر بیٹھتی تھی مگر چپ چاپ۔

مردوں کے سامنے بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے کی ہمت نہیں تھی مگر اہم ادیبوں اور شاعروں کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا بہت شوق تھا۔ مجھے امریتا پریتم کے افسانے اور ناول بھی بہت پسند تھے۔ انھیں دیکھنے کو جی چاہتا تھا ایک بار ہم دہلی گئے تو ہمت کر کے میں نے امریتا پریتم کو فون کر دیا۔ انھوں نے بڑے خلوص سے اپنے گھر بلایا۔ بڑے پیار سے ملیں، میرے افسانے پڑھ چکی تھیں۔

بہت تعریف کی۔ انھوں نے میرے دو تین افسانوں اور ناولٹ کا ترجمہ پنجابی زبان میں کر کے اپنے رسالے ''ناگ منی'' میں شائع کیا تھا۔ ہم جب دہلی جاتے تھے تو وہ امروز کے ساتھ خود آ کر ہمیں اپنے گھر لے جاتی تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کی بہت سی اہم باتیں سنائی تھیں۔ اپنے افسانوں کے بارے میں بتایا تھا کہ کب لکھے تھے؟

میں نے ٹی وی کے لئے تین چار سیریئل کی کہانی لکھی۔ انور نے اور فرحان نے وہ سیریئل تیار کیے۔ دوردرشن کے لئے یہ سریئل بنائے تھے۔

منجو ستلگر کے سیریئل ایک کہانی کے لئے میں نے آندھرا پردیش کے کسانوں کی پریشانیوں پر ایک کہانی لکھی تھی ''نرسیا کی باوڑی''، فلم ڈائریکٹر شیام بینگل کو میری یہ کہانی بہت پسند آئی اور انھوں نے اس کہانی کی فلم بنائی ہے ''ول ڈن ابا''۔

میں نے آندھرا پردیش کے گاؤں میں جا کر دیکھا ہے وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں گھر کے بند کمرے میں بیٹھ کر افسانے نہیں لکھتی ہوں۔ آندھرا پردیش کے گاؤں میں آج بھی باؤنڈیڈ لیبر سسٹم ہے، بارش نہ ہو تو کھیت سوکھ رہے ہیں۔ ہمارے لیڈر، منسٹر ووٹ لینے گاؤں میں جاتے ہیں، گاؤں والوں سے وعدے

کرتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں، گاؤں کے ان مسائل پر ایک ناول بھی لکھا ہے۔ ''بارشِ سنگ'' اس ناول کا تلگو، مراٹھی، انگلش، ہندی اور ملیالم زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ٹی وی کے لئے میں نے مشہور آرٹسٹ، ایم ایف حسین کا انٹرویو لیا تھا، قرۃ العین حیدر کا انٹرویو بھی لیا تھا، ریڈیو کے لئے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔

اور کیا سناؤں آپ کو......؟

انور کے ساتھ سارے زمانے کی سیر کی ہے۔ پاکستان تو بار بار گئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے بیچ سیاسی حالات بنتے بگڑتے رہتے ہیں، مگر دونوں ملکوں کے ادیبوں، آرٹسٹوں نے جو پیار اور اعتبار کا پل بنایا ہے وہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ وہاں کے ادیبوں نے، ایڈیٹروں نے شروع سے میرے افسانوں کو پسند کیا اور میری پہلی کتاب ''روشنی کے مینار'' پاکستان سے بھی شائع ہوئی۔ فیض احمد فیض نے میرے افسانے پسند کر کے مجھے خط لکھا تھا۔

بھائی احمد ندیم قاسمی، میرے بڑے بھائی جیسے تھے۔ محمد طفیل، مشفق خواجہ، جمیل جالبی، مرزا ادیب، فیض احمد فیض، حنیف رامے، اسلم ترخی، آصف ترخی، اشفاق احمد، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، کشور ناہید،

کس کس کے نام سناؤں آپ کو......؟

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے میرے افسانوں کی کتاب "کن" شائع کی ہے۔ ملک تورانی صاحب اور ان کی بیٹی حوری تورانی نے میری ہر کتاب کا پاکستان ایڈیشن شائع کیا۔ کراچی لاہور کے کئی سیمیناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ مجھے اور انور کو حکومت پاکستان نے اپنا مہمان بنا کر پورے پاکستان کی سیر کرنے کے لئے بلایا تھا۔ 1998 میں عالمی فروغ اردو دوحہ قطر کا انٹرنیشنل ایوارڈ ملا تھا تو پورے مڈل ایسٹ کی سیر کی تھی۔

امریکہ کئی بار گئی ہوں، ڈائیلاس، میری لینڈ، واشنگٹن، بالٹی مور، ہیوسٹن، شکاگو، ہر جگہ کی سیر کی، وہاں کے اردو ادیبوں سے بھی ملی۔

2003 میں وس کاونسن یونیورسٹی نے ساؤتھ ایشین، رائیٹرس کانفرنس میں مجھے بھی بلایا تھا۔ وہاں میں بہت گھبرا رہی تھی۔ دور دور کی یونیورسٹی کے پروفیسر اور ادیبوں سے ہال بھرا ہوا تھا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے سب مجھ سے سوال کر رہے تھے۔

ایک پروفیسر صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ "آپ ایک مسلم خاتون ہیں تو آپ کو افسانے لکھنے کی اجازت کیسے ملی؟"

میں نے جواب دیا کہ ہم جو لکھنا چاہتے ہیں اسے لکھنے سے ہمیں تو کسی نے نہیں روکا لیکن شاید! آپ کو انڈیا جانے سے روک دیا گیا ہے۔ ورنہ آپ مجھ سے ایسے سوال نہ کرتے۔

ہیوسٹن میں میری بہن رہتی تھی۔ وہ بھی بہت مشہور آرٹسٹ تھی، اب اس کا انتقال ہو گیا ہے۔

1985 میں مجھے ''سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ'' ملا تھا تو پورے روس کی سیر کی تھی۔ لینن گراڈ، والسر گراڈ، سمرقند، ہر جگہ گئی تھی۔ وہاں کے مشہور ادیبوں سے ملی تھی۔ قدیم ساگا نیک اور دلادوسوکومون نے میرے افسانوں اور ناولوں کے روسی زبان میں ترجمے کئے ہیں۔ دلادوسوکومون نے میرے افسانوں پر ریسرچ کی ہے۔

اب 2009 میں ماسکو گئی تھی میں تو دلادوسوکومون سے ملی تھی۔ وہ اب پروفیسر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے میرے افسانوں ناولوں کا روسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ دوسری بار انور کے ساتھ ابوالقاسم لاہوتی سیمینار میں گئی تھی۔

2009 میں نیشنل بک ٹرسٹ نے ماسکو میں ایک بہت اچھا سیمینار کیا تھا، وہاں بھارت کی زبان کے ادیبوں کے ساتھ میں بھی گئی تھی۔ سینٹ پیٹرس برگ کے ادیبوں سے ملے۔ میوزیم دیکھے۔ میں سولہ برس کے بعد سینٹ پیٹرس برگ

آئی تھی جب یہ لینن گراڈ تھا۔ سیاست اور تاریخ کے اتار چڑھاؤ نے اس شہر کو بھی بدل دیا تھا وہاں کے ادیبوں، آرٹسٹوں اور میزبانوں کا وہی خلوص تھا، سینٹ پیٹرس برگ گئی تو مجھے اس شہر کی ایک شام یاد آنے لگی۔

1986 میں جب مجھے ''سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ'' ملا تھا تو مریم سلگانیک کے ساتھ باشویک تھیٹر میں ایک ڈرامہ دیکھنے گئی تھی۔

وہ زار کا محل تھا، کئی سو سال پرانی عمارت کے اندر ایک تھیٹر ہال بنا دیا تھا، مگر اس عمارت کی ہر چیز ویسی ہی تھی۔ سونے چاندی کے نقش و نگار والی چھتیں، دیواریں، شاندار فرنیچر، وزیروں کے بیٹھنے کے لئے نقش و نگار والی کرسیاں اور بہت اونچے اسٹیج پر ہیرے جواہرات سے سجی ہوئی زار کے بیٹھنے کی کرسی تھی۔ مریم سلگانیک نے میرا ہاتھ پکڑ کے بہت اصرار کر کے مجھے اس کرسی پر بیٹھا کر فوٹو لیا تھا۔ اور محترمہ جیلانی بانو بڑے آرام سے زار کے تخت پر بیٹھ گئیں تھیں۔

اب آپ ہی سوچئے کہ ایک بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے کا چانس ملا بھی تو کہاں؟ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں؟

زار کے تخت پر بیٹھ کر میں نے سوچا تھا کہ بادشاہ بن کر حکومت کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

''ایوان غزل''، ''بارش سنگ'' ناول اور میرے افسانے پڑھنے کے بعد شاید آپ کو اندازہ ہو جائے کہ میں بند کمرے میں بیٹھ کر افسانے نہیں لکھتی ہوں۔ میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے، شہر سے دور گاؤں میں کیا ہو رہا ہے، گاؤں میں جا کر دیکھو تو بے سہارا عورتوں اور کھیتوں میں مزدوری کرنے والے بچوں کو آپ دیکھتے ہیں۔

میں ''یوتھ فار ایکشن'' کے ساتھ بیس برس سے ہوں، یہ آرگنائزیشن گاؤں کی عورت کی تعلیم کے لئے کام کرتی ہے۔ ان کے قانونی، سماجی حقوق کے لئے کام کرتی ہے۔

میں ''استمیاری سورس دی آرگنائزیشن'' کی چیئرمین ہوں، استمیا'' گاؤں اور شہر کی بے سہارا عورتوں کی صحت، تعلیم اور ان کے سماجی مذہبی، قانونی حقوق کے لئے کام کرتی ہے۔

اب شاید آپ کو اندازہ ہو جائے کہ میں ہاتھ میں قلم تھام کر وہاں کیوں پہنچ جاتی ہوں جہاں خود جانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔

میں خالی پیپر پر جب کچھ لکھنا چاہتی ہوں تو ایسا لگتا ہے میں کوئی اور ہوں اور دور کھڑی دیکھ رہی ہوں کہ میں نے کیا لکھا ہے؟ کیوں لکھا ہے؟

اب میں حیدرآباد کی تہذیب اور حیدرآباد کی مخصوص زبان کے بارے میں کچھ کہوں گی، بہت کم ایسے شہر ہیں جو اپنی مخصوص تہذیب اور اپنے علمی ادبی مرکز کی وجہ سے اتنے مشہور ہوں۔

ملک کے باہر بھی ایک حیدرآبادی اپنی مخصوص تہذیب اور بات کرنے کے ایک منفرد انداز سے پہچان لیا جاتا ہے۔ اس لئے سعودی عرب، امریکہ، لندن، پاکستان ہر جگہ حیدرآبادیوں کی علمی ادبی انجمن قائم ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ وہ کونسے اہم پہلو ہیں جو حیدرآباد تہذیب میں نظر آتے ہیں؟

حیدرآبادی تہذیب مختلف ملکوں اور زبانوں سے مل جل کر بنی ہے حیدرآبادی اردو بولنے والے کو آپ فوراً پہچان لیتے ہیں۔ ایک حیدرآبادی اپنے کسی بزرگ کے آگے جھک کر سلام کرتا ہے اور جاتے وقت بھی جھک کر کہتا ہے ''تو پھر حاضر ہوتا ہوں'' ''کل میں آیا تو آتوں، نئی آیا تو نئی آتاوں''۔ میں نے حیدرآباد کی اس مخصوص زبان کو باقی رکھنے کے لئے بیس آڈیو کیسٹ میں محفوظ کیا ہے۔

دکنی زبان بولنے کا مخصوص انداز ہے۔ میں نے بچوں کے کہانی سنانے کے انداز سے شروع کیا ہے۔ عام عورتوں کی بول چال، نوجوانوں کا ہنسی مذاق،

عورتوں کی لڑائی، شاعروں، دانشوروں کے بات کرنے کا انداز، دکن کے ادیبوں کا دکن کے بارے میں انٹرویو، دکنی زبان کے شاعروں کی شاعری۔

دکنی زبان کو محفوظ کرنے کا میرا یہ کام سب کو پسند آیا ہے۔ بہار کی خدا بخش لائبریری، نے اسے لے لیا ہے۔ علی گڑھ، دہلی، حیدرآباد ہر جگہ کے ادیبوں نقادوں نے اسے پسند کیا۔ پاکستان کی لائبریریوں نے اپنے پاس رکھا ہے۔ امریکہ میں ٹکساس یونیورسٹی نے اسے اپنی لائبریری میں رکھا ہے۔ پنجاب اور لکھنو کے ادیبوں نے بھی کہا تھا کہ وہ پنجاب اور لکھنو کی اردو کو محفوظ کرنے کے بارے میں پروگرام بنائیں گے۔

شادی کے ایک برس کے بعد ہمارے پاس ثمین آ گیا۔ ثمین کو گود میں لے کر میں سوچتی تھی کہ عورت انسان کو تخلیق کرتی ہے تو آسمان پر بیٹھے اللہ میاں کیا کرتے ہیں؟

مگر ثمین کو مجھ سے چھین کر اللہ میاں نے مجھے بتا دیا کہ وہ کیا کیا کر سکتے ہیں؟ میں دن رات خالی ہاتھوں کو دیکھا کرتی تھی۔ لکھنا پڑھنا ختم ہو گیا تھا، پھر اللہ میاں نے بتا دیا کہ اور کیا کیا کر سکتے ہیں؟

فرحان آ گیا! پھر فرحان نے مجھے اٹھایا، چلنا، ہنسنا سکھایا، میرے ہاتھ میں

قلم دے کر مجھے ایک کرسی پر بیٹھا دیا ہے۔ اب فرحان میرے آگے ایک روشن چراغ لے کر چلتا ہے۔ ''اس کمرے کے باہر کیا ہو رہا ہے؟ ساری دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ وہ سب بھول جائیے، آپ کو جو لکھنا ہے، لکھتی رہیئے۔''

فرحان نے کمپیوٹر سائنس انجینئر نگ میں ڈگری لی۔ اور پھر انھوں نے کمپیوٹر کے فن میں نئے نئے تجربے کیے۔ اردو نستعلیق کا پہلا ''صفحہ ساز'' پیج کمپوز، تیار کرلیا۔ اب اردو لکھنے کے لئے کاتبوں کی ضرورت نہیں رہی۔ سب سے پہلے حیدرآباد کے عابد علی خاں صاحب نے اپنے اخبار ''سیاست'' کے لئے اسے حاصل کیا۔ ''سیاست'' اردو کا پہلا اخبار ہے جو کمپیوٹر پر کمپوز ہونے لگا۔ پھر دوسرے اخباروں نے بھی اس کو استعمال کرنا شروع کردیا۔

فرحان انٹرنیٹ کے فن میں آگے بڑھتے گئے، ان کے تیار کیے ہوئے دو پروگرام اب ساری دنیا کے کئی ملکوں میں استعمال کئے جاتے ہیں، اب فرحان انٹرنیٹ ٹیلی فون کے میدان میں آگے ہیں۔ فرحان کو موسیقی، ادب آرٹ سے بھی بے حد دلچسپی ہے۔

انھوں نے انور کے ساتھ اردو کی پہلی وضاحتی کتابیات (سوشل سائنس) مرتب کی ہے۔ ہمارے بنائے ہوئے سب ٹی وی سیریلوں کی تیاری میں کام کیا

ہے۔انور نے حیدرآباد کی تہذیب پر ایک ڈاکومنٹری بنائی تھی۔''حیدرآباد،ایک شہر،ایک تہذیب'' دوردرشن کے لئے اور کئی سیریل بنائے،منزلیں بہار کی، ننھے کا سفر،اپنی تلاش میں'' ان کی تیاری میں انور کے ساتھ فرحان نے بھی بڑی دلچسپی اور محنت سے کام کیا ہے۔

فرحان نے ایک سافٹ ویئر کمپنی قائم کی ہے جس کا نام ہندوستان کے باہر بھی کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے گھر میں بیٹی نہیں تھی۔فرحان اکیلے تھے۔پھر فرحان کے لئے ہم حمیدہ کو لے آئے تو بیٹی کی کمی پوری ہوگئی۔

حمیدہ نے اپنے پیار اور ذہانت کے اتنے چراغ روشن کردیئے کہ چاروں طرف روشنی پھیل گئی ہے۔حمیدہ نے مجھے گھر اور خاندان کے سارے مسائل، ساری ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا ہے۔

پھول ہی پھول کھل اٹھے میرے پیمانے میں　　آپ کیا آئے بہار آگئی میخانے میں

حمیدہ کو ہرفن سے دلچسپی ہے،اچھے کھانے بنانے کا بھی شوق ہے اور اچھے کپڑوں کا بھی انتخاب کرتی ہیں۔ خاندان میں کسی کے ہاں کوئی تقریب ہو یا کوئی بیمار ہو جائے ۔حمیدہ سے مشورہ لیا جاتا ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ میں بیمار ہوجاؤں ، ڈاکٹر مجھے کوئی دوا دے مگر جب تک حمیدہ کا مشورہ نہ ہو میں وہ دوا

استعمال نہیں کرتی ہوں۔

حمیدہ نے گھر میں تین چراغ روشن کردیئے ہیں۔ تین پھول کھل گئے ہیں۔

ان تینوں بچوں نے مجھے اور انور کو ساری فکروں سے آزاد کردیا ہے۔

رجاء دس برس کی ہے، آرٹ، ادب اور پینٹنگ کرنے کا شوق ہے۔ میرے افسانوں کی نئی کتاب ''راستہ بند ہے'' اور خطوط کی کتاب ''دور کی آوازیں'' ان دونوں کتابوں کے ٹائٹل رجاء نے بنائے ہیں۔ کمپیوٹر پر کام ہوتا ہے۔ رمشاء کو کہانیاں اور نظمیں لکھنے کا شوق ہے۔ انھوں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ ہر وقت ایک کتاب کھولے بیٹھی رہتی ہے۔ کہانیاں بھی لکھتی ہے اور نظمیں بھی لکھتی ہے۔ کمپیوٹر پر کام کرتی ہے۔ ادب آرٹ موسیقی سے دلچسپی ہے۔ اسکول میں سنگیت بھی سیکھ رہی ہے۔ ریان چار برس کے ہیں۔ دادا کے ساتھ ان کی ٹیبل کے سامنے کمپیوٹر کھولے بیٹھتے ہیں۔ اور دادا کے ساتھ، مذہب، آرٹ ادب کے بارے میں طویل بحثیں ہوتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر میری سب سے زیادہ پسندیدہ افسانہ نگار تھیں۔ مجھے ان کا فن جتنا عظیم لگتا تھا ان کی شخصیت بھی اتنی ہی محبت اور شفقت کرنے والی ایک بہن جیسی تھی۔

میرے اور انور کے ساتھ بہت دلچسپ باتیں ہوتی تھیں۔ ادیبوں کی نقل اور ادبی گروپ بندی اور آپسی اختلاف کی خبروں کو وہ چندو خانے کی خبریں کہتی تھیں۔ انھوں نے میری پہلی کتاب روشنی کے مینار، پڑھ کر میرا حوصلہ بڑھایا تھا۔ میں جب کبھی کسی سیمینار میں یا کسی اور کام سے دہلی جاتی تھی تو ایک دن عینی آپا کے ساتھ ضرور گزارتی تھی۔ ایک بار حیدرآباد آئیں تو ایک دن ہمارے گھر رہیں۔

فیض صاحب نے میرا پہلا دوسرا افسانہ پڑھ کر راولپنڈی سے مجھے خط لکھا تھا جب وہ پیرول پر رہا ہوئے تھے، ایک بار کسی سیمینار میں حیدرآباد آئے تو ہمارے گھر بھی آئے، سب کے ساتھ کھانا کھایا، مجھ سے کہا ''آپ اچھے افسانے لکھتی ہیں، مزیدار کھانے بھی بنالیتی ہیں۔'' اپنی ایک نظم سنائی، انور سے بھی کچھ سنتے رہے۔ ہم بمبئی جاتے تھے تو عصمت آپا اصرار کرکے اپنے گھر میں ہی روک لیتی تھیں۔ پھر راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، عصمت آپا کے گھر ہی ملنے کو آتے۔

خواجہ احمد عباس، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، ہم دونوں سب ہی اہم ادیبوں شاعروں سے ملے تھے۔

شکیل بدایونی میرے والد کے رشتے کے بھائی تھے، بمبئی میں نوشاد کے ساتھ اور دوسرے موسیقاروں کے ساتھ بہت اچھے فلمی گیت لکھ رہے تھے۔ وہ انور کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ ہم دونوں بمبئی گئے تو اپنے ساتھ نوشاد، دلیپ کمار اور بہت سے فلم اسٹاروں اور ادیبوں سے ملانے لے گئے تھے۔

عصمت آپا کے اور شاہد لطیف صاحب کے ساتھ کرشن چندر سے ملنے گئے تو میں بہت گھبرا رہی تھی۔ اتنے بڑے اہم ادیب کے گھر میں جا رہی ہوں؟ مگر کرشن چندر بڑی اپنائیت سے ملے، میرے سر پر ہاتھ رکھا اور ہنس کر بولے میں تو سمجھا تھا جیلانی بانو کوئی لحیم شحیم خاتون ہوں گی۔ پھر وہ کسی کانفرنس میں حیدرآباد آئے تو ہمارے گھر بھی آئے، کھانا کھایا، سلمٰی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ گوشت اور شکر کی مٹھائی نہیں کھائیں گے۔ کھانا ختم ہو گیا تو کرشن چندر کچن میں آئے اور مجھ سے آہستہ سے بولے۔ ''بانو! وہ مزیدار کباب کہاں ہیں؟ ہمیں بھی کھلاؤ، سلمٰی سے مت کہنا، جلدی جلدی کباب کھائے، منہ صاف کر کے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

بمبئی جاتے تھے تو سلطانہ بھابی سے اور سردار جعفری صاحب سے بھی

ضرور ملتے تھے۔ جعفری صاحب کا اصرار تھا کہ ''گفتگو'' رسالے کے ہر شمارے میں میرا افسانہ شامل ہو۔ انھوں نے مشہور ادیبوں پر ''کہکشاں'' سیریئل بنایا تو مخدوم کا اے پی سوڈ مجھ سے لکھوایا تھا۔

سردار جعفری صاحب نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی، مخدوم کا اے پی سوڈ لکھوانے کے لئے انھوں نے مجھے جو خط لکھا تھا وہ ان کی شخصیت اور خلوص کو ظاہر کرتا ہے۔

30.08.1978

بانو بی بی!

ایک اچھی خبر یہ ہے کہ عہد حاضر کے چند اہم شاعروں پر ایک سیریئل بنا رہا ہوں ''کہکشاں''۔ میں چاہتا ہوں اس میں کچھ تمہارے جیسے تخلیقی ذہن بھی شامل ہوں۔ اس سیریئل میں مخدوم پر بھی دو اپی سوڈ ہوں گے، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ اپی سوڈ تم لکھ دو۔

پھر تمہاری اور میری کاوشوں کو ملا کر جو چیز بنے گی وہ مخدوم کے شایان شان ہو گی۔

سردار جعفری

مرزا ادیب پاکستان سے تھے، اور ہم نے اپنا پہلا افسانہ ''ادب لطیف'' کو بھیجا تھا یہاں میں ان کے خط کا بھی ایک حصہ آپ کو سنا دوں۔

19.08.1971

میری عزیز بہن!

آپ کا پر خلوص خط ملا۔ یوں جیسے ایک ہوا کا جھونکا دل کی گہرائیوں میں داخل ہو گیا۔ میں نے اکثر اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مجھے فخر ہے کہ میں نے موجودہ دور کی بے مثال افسانہ نگار جیلانی بانو کا پہلا افسانہ ''موم کی مریم'' ادب لطیف میں چھاپا تھا۔

آپ کا بھائی

مرزا ادیب

میں یہاں چند اہم ادیبوں کے وہ خط آپ کو سنا رہی ہوں جو انھوں نے مجھ جیسی ایک نو آموز لڑکی کی ہمت افزائی کے لئے لکھے تھے۔

کیا آج ہم میں یہ خلوص ہے کہ کسی نئے ادیب کا اچھا افسانہ پڑھ کر اسے خط بھی لکھیں؟

یہ ادب کا وہ دور تھا جب کسی نئے لکھنے والے کی اچھی نظم، اچھا افسانہ ادبی حلقوں تک پہنچ جاتا تھا۔ سب ادیب، شاعر، نقاد اس نئے لکھنے والے کی تحریر کو پڑھتے تھے اور اپنی رائے بھی دیتے تھے۔

فیض صاحب راولپنڈی جیل سے پیرول پر رہا ہوئے تھے، مگر انھوں نے میری کتاب پڑھ کر مجھے خط لکھا تھا۔

اسلوب احمد انصاری صاحب نے اردو کے پندرہ اہم ناولوں میں ''ایوان غزل'' کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ محمد حسن صاحب نے میرے افسانوں کے بارے میں لکھا۔ ریڈیو سے بھی تبصرہ کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر نے مجھے خط بھی لکھے۔ میرے افسانوں اور ناولوں کے بارے میں اپنی رائے دی۔ میرے افسانوں کا انگلش میں ترجمہ کیا۔

عصمت آپا نے ''ایوان غزل'' پڑھ کر مجھے خط لکھا تھا

''تم نے ایوان غزل لکھ کر باؤنڈری ماری ہے۔ اب ''پرایا گھر'' لکھ کر اترا ومت۔''

میں چند اہم ادیبوں کے خط آپ کو سنا رہی ہوں۔ مشہور نقاد اردو ادب کے ان اہم ادیبوں کی توجہ بالکل نئے لکھنے والوں پر بھی جاتی تھی۔ وہ نئے لکھنے

والوں کی کتابیں پوری توجہ سے پڑھتے تھے اوران کتابوں کے بارے میں اپنی
نجی رائے دینا بھی ضروری سمجھتے تھے۔

ایمپریس روڈ 14

لاہور، 28/جون

فیض احمد فیض

جیلانی بانو صاحبہ! تسلیم

آپ کی عمر دراز معلوم ہوتی ہے۔ جیل میں آپ کی تحریریں نظر سے
گزریں۔ تعارف کی خواہش تھی لیکن معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں ہیں۔ اس لئے
آپ کے خط سے بہت مسرت ہوئی۔

میرے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ تو خیر مبالغہ ہے لیکن میں
جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کی دوستی اور خلوص مبالغہ نہیں، حقیقت ہے، اور جو مبالغہ
بھی ہوتو کچھ کم وجہ مسرت نہیں ہے اس کا شکریہ ادا کرنا تو تکلف ہوگا۔ لیکن اس
کی وجہ سے کنج قفس میں جو فراغت اور آسودگی نصیب رہی ہے وہ بیان نہیں
کرسکتا۔

ادبی تنظیم اور ان کی اصلاح آپ نئے لکھنے والوں کا کام ہے اور آپ ہی اسے پورا کریں گے۔ میدان حشر کی طرح اس میدان میں بھی اپنا بوجھ ہر کسی کو خود اٹھانا پڑتا ہے۔

ابھی ہمارا مقصد طے نہیں ہو پایا ہے۔ فی الحال ضمانت پر ہیں۔ نجات ہوگئی تو پھر گفتگو ہوگی۔

مخلص، فیض

بمبئی

9/ اگست 1965

بہت پیاری بانو! دعائیں

بھئی جواب نہیں تمہارے پہلے خط پر تو 28/ جون کی تاریخ لکھی تھی۔ دوسرے خط پر 13/ جولائی لکھا ہے اور مجھے ملا ہے پرسوں۔

موصوفہ تمام صوفیوں کی مانند Timelessnes میں ہی رہتی ہیں۔

اب چونکہ انجمن تعارف باہمی باضابطہ قائم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اطلاعاً عرض ہے کہ آپ سے ملاقات کر کے سخت مسرت ہوتی، کہ بھئی یہ لڑکی تو ہم ادیب جیسے

لوگ اور ادیب دل کی بجائے نہایت معقول سیدھی سادھی Modest نکلی۔

یعنی یہ کہ شہرت اور ادبی کامیابی نے جو ذرا دماغ خراب کیا ہو؟

واقعی یہ بہت بڑی بات ہے اور چونکہ ہم ادیب لوگ ہر قسم کی برخود غلط خواتین کو کافی جھیل چکے ہیں۔ لہٰذا تھوڑے لکھے کو بہت جانو اور خط کو مبارکباد کا تار سمجھو۔

ہاں بھئی غیبت کانفرنس ضرور ہوگی۔ جب انشاءاللہ حیدرآباد تمہارے گھر آؤں گی۔ مسالہ جمع رکھو، غیبت کرنے والے کافر نہیں ہیں۔ ادبی کوائف...... خاکسار نے، دھرم یگ، میں ایک کام چلاتی کہانی لکھی ہے دوسری کہانی مکمل کرنے کا وقت نہیں ملتا۔

عصمت آپا سے عرصے سے ملنا نہیں ہوا۔ کرشن اور سلمیٰ سے بھی زمانے سے ملاقات نہیں ہوئی۔

یہاں کوئی قابل بات نہیں ہوئی، سوائے اس کے کہ پچھلے دنوں ایسی بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ فی الحال حجاب امتیاز علی کے کاسنی آسمان پر صرف ایک اداس بادل آوارہ پھر رہا ہے اور ایک سمندری پرندہ لیموں کی گھانس پر بیٹھا سیٹی بجا رہا ہے اور میری موم جیسی انگلیاں خط لکھ کر تھک گئی ہیں۔

چنانچہ میں زیتون کے تیل میں بھنی ہوئی سرخ مچھلی گیہوں کی روٹی کے ساتھ کھا کر سمندری کوٹ پہن کر، جو میں نے ساحل کے پاس میں خریدا تھا، چہل قدمی کروں گی۔

خدا حافظ

تمہاری اینی آپا (قرۃالعین حیدر)

30.08.1978

عصمت چغتائی

پیاری بانو!

''ایوان غزل'' پڑھنا شروع کی تھی کہ اس درمیان میں لکھنو چلی گئی۔ احتیاطاً ساتھ نہ لے گئی کہ کوئی صاحب اڑا نہ لے جائیں۔

اب سردار نے کہا ہے کہ وہ مجھے اپنی کتاب بھجوا دیں گے۔ انھوں نے مجھ سے اس پر تبصرہ کرنے کو بھی کہا ہے جو میں ناول ختم کر کے لکھوں گی۔ میں نے جتنی ناول پڑھی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم نے باؤنڈری ماردی ہے بہت خوبصورت ناول ہے۔ تم مجھے اتنا ناانصاف سمجھتی ہو۔ تمہاری اس ناولٹ پر میں نے تکنیک کی وجہ سے نہیں کچھ کرداروں کی وجہ سے اعتراض کیا تھا۔ تمہارے اس

نئے ناول ''ایوان غزل'' میں کوئی کردار بور نہیں لگا مجھے، تم مجھ پر اتنا بھروسہ نہیں کر سکتی؟ تم یہ ناول لکھ کر صفِ اول میں آن جمیں۔

ناول کا خاتمہ دیکھ کر تبصرہ کروں گی۔ سردار چھاپیں گے۔

تمہاری

عصمت آپا

22.07.1976

ڈاکٹر محمد حسن

آپ کا نوازش نامہ اور ''ایوان غزل'' دونوں ملے۔

آپ نے اپنے ناول کی اشاعت کے موقعہ پر یاد فرمایا اور اسے پڑھنے کا موقعہ دیا۔ ناول نہایت خوبصورت ہے۔ آپ نے بلاشبہ اردو کے عظیم ناولوں میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ایوان غزل ایسا ناول ہے جس کا خواب اردو ادب برسوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسی دل سوزی اور دردمندی سے آپ نے یہ داستان لکھی ہے کہ اسے ایک کلاسیک کا درجہ ملنا چاہئے۔ آپ کو اس کارنامے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

محمد حسن

احمد ندیم قاسمی

امروز لاہور

23 اپریل 2003

عزیز بانو بہن ..... دعا!

صبح، دوپہر، شام کے بارے میں تفصیل سے کل پرسوں لکھوں گا، فی الحال اتنا ہی عرض کر سکوں گا کہ اگر آپ یہ ناولٹ نہ لکھتیں تو اپنے علاوہ اردو ادب پر ظلم کرتیں۔ اب تک اسے صرف میں نے اور منصورہ نے پڑھا ہے۔ توصیف کہہ رہا تھا کہ انھیں ناولٹ بہت پسند آیا۔ سرشار بیٹھی تھیں۔

مختصر کہانیاں نہایت موثر ہیں۔ آپ انھیں نظم نہ کہیے، نثر کو نثر ہی رہنے دیجیے۔ سب کہانیاں عمدہ ہیں۔ میں نے مختصر کہانیاں تو آئندہ کے لئے رکھ لی ہیں۔ البتہ نسبتاً طویل کہانی ''تم سن رہے ہو؟، میں جارہا ہوں'' فنون کے تازہ شمارے میں شامل کر لی ہے۔ اس کہانی میں اتنی بڑی پُر ہول حقیقت کو آپ نے فن لازوال کر دیا ہے۔ آپ کی تحریریں پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔

آپ کا بھائی

ندیم

''روشنی کے مینار'' پر تفصیل سے لکھوں گا، مگر ذرا رک جایئے۔ میں اپنے تاثرات نقادوں کے خود ساختہ میناروں پر چڑھ کر نشر نہیں کروں گا۔ میری تو عادت ہے کہ نو آموزوں کے بھی برابر بیٹھ کر ان کے فن پر بات کرتا ہوں اور بعض اوقات ان سے کچھ سیکھ بھی لیتا ہوں۔

آپ تو نو آموزی کی منزل سے کوسوں دور نکل چکی ہیں اور اس منزل پر ہیں جہاں ایک نئی روایت کا آغاز ہوتا ہے اور آپ اس نئی روایت کے رہنماؤں میں سے ہیں۔ پھر آپ مجھے تجمی اور خدیجہ کی طرح عزیز ہیں۔ اس لئے مجھے آپ سے جو باتیں کرنا ہیں ان کی نوعیت نقادانہ نہیں ہوگی۔ لگی لپٹی بھی نہیں رکھوں گا اور بجنل بھی نہیں بنوں گا۔ مجھے آپ کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے۔ بس چند دن رک جایئے۔

آپ کا بھائی

ندیم

نوٹ: برادرم انور معظم کی نظمیں اتنی عمدہ ہیں کہ ان کی بجائے آپ کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ چاروں نظمیں اب کی بار ''فنون'' میں آرہی ہیں۔

ممتاز حسین

29 / نومبر 1991 ادارہ 'طلوع افکار' اور فکشن گروپ کے ایک جلسے کی صدارتی تقریر کا اقتباس، کراچی، پاکستان۔

''سقوط حیدرآباد کے بعد وہاں جو سیاسی اور طبقاتی کشمکش شروع ہوئی اس کی عکاسی بلکہ مصوری جیلانی بانو نے اپنے افسانوں میں نہایت موثر اور فن کارانہ انداز میں کی ہے۔ اس وقت وہ ہندوستان کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ممتاز نظر آتی ہیں۔

جیلانی بانو کے ناول 'ایوان غزل' کا کینوس عزیز احمد اور محمد احسن فاروقی کے ناولوں کے مقابلے میں وسیع تر ہے۔ جیلانی بانو کا شعور اپنے عہد کے المیے کو ایک خاص علاقے کے حوالے سے تاریخی شعور کے تابع دیکھتا ہے۔

'ایوان غزل' کی علامت، اس کے اختتام پر ماضی کی ایک شاندار تہذیب کے انہدام کے استعارے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بتاتی ہے کہ وقت کے بے روک ٹوک سفر میں تہذیب کے وقت کا اپنا ایک فطری اور حیاتیاتی نظام کام کرتا ہے۔''

ممتاز حسین

قمر رئیس

01.09.2004

جیلانی بانو! تسلیم

مضمون اور خط ملا۔

شکر گزار ہوں۔ عصمت صاحبہ کا خاکہ آپ نے اپنے ڈھنگ سے نہایت دلچسپ انداز سے کھینچا ہے۔ اچھا ہو کہ اپنے معاصرین کے بارے میں اسی طرح کے خاکے آپ لکھ ڈالیں۔ ایک جگہ آپ لکھتی ہیں۔

''میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ کبھی نہیں رہی۔ پتہ نہیں اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

میں تو آپ کو ترقی پسند ادب اور نظریۂ ادب کے کارواں میں بہت اہم سمجھتا ہوں۔

آپ کی تحریروں میں معاشرہ اور سیاست کی مارکسی تفہیم و تشکیل کا بہت سلجھا ہوا سنجیدہ شعور ملتا ہے۔ اس نے آپ کے بعد کی پیڑھی کی خواتین فکشن نگاروں کو خاص طور پر متاثر کیا ہے۔

میرا خیال ہے (شاید آپ اسے اتفاق نہ کریں) کہ مارکسزم اور ترقی پسند

فکری روایت سے اتنی گہری وابستگی کے بغیر آپ اس بلند مرتبہ کی ادیبہ نہ بن پائیں۔

انور صاحب کو آداب کہیے۔

مخلص

قرۃ العین

اب تک میں نے کیا لکھا ہے، اور مجھے کہانی کہاں مل جاتی ہے؟ ابھی کچھ دن پہلے نسیم احسن صاحب کلکتہ سے آئے تھے وہ میرے افسانوں پر ریسرچ کر رہے تھے۔ انھوں نے میرا انٹرویو لیا تو پوچھا ''آپ کو کہانی کا آئیڈیا کہاں سے ملتا ہے؟ کیسے ملتا ہے؟'' میں بھی یہ بات سوچنے لگی۔

نسیم صاحب کے آنے سے پہلے میرے پاس محبوب بی بیٹھی تھیں۔ محبوب بی پہلے ہمارے گھر میں کام کرتی تھیں۔ اب بوڑھی ہو گئی ہیں۔ گاؤں میں رہتی ہیں۔ ان کے کھیت ہیں، زمین ہے، گاؤں میں بیٹے کسان ہیں۔ مگر اب اسی گاؤں میں گورنمنٹ کوئی بڑا ڈیم بنا رہی ہے تو ان کے کھیتوں کی آدھی زمین بھی گورنمنٹ لے رہی ہے۔ بہت پریشان تھیں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ تمہیں اس

زمین کی قیمت مل جائے گی۔ دوسری زمین خرید لینا۔

''ہم کو کچھ نہیں ملتا بانو بی بی۔ انھوں کے لوگاں سرکار سے پیسے لے کر خود کھا لیتے ہیں۔ ہم سے کہتے ہیں، تم جا کر سنٹر سے پوچھو کہ کھیتوں کی قیمت ہمیں کیوں نہیں ملی؟

ان کی بات سن کر میں چپ ہوگئی، اور پھر آج کا نیوز پیپر اٹھا کر محبوب بی کو ایک دلچسپ نیوز سنا کر ہنسنے لگی۔

''ایک خبر سنو محبوب بی؟''

ایک چور نے دو ہزار روپے چرا لئے۔ جب پولیس اسے پکڑنے آئی تو اس نے دو ہزار کے نوٹ منہ میں ڈال کر نگل لئے۔ پولیس انسپکٹر اسے ہاسپٹل لے گیا۔ ڈاکٹر نے اس کے حلق کی سرجری کر کے نوٹوں کے پرزے نکال لئے۔

یہ خبر سنا کر میں ہنسنے لگی تو محبوب بی خوش ہوگئیں اور تعجب کے ساتھ بولیں ''آئیں اللہ...... ڈاکٹر چوروں کے منہ میں سے بھی روپے نکال سکتے ہیں؟ اور پھر مایوسی کے ساتھ بولیں ''بانو بی بی، اب کوئی منسٹر بیمار ہوا تو بھی وہ اس ڈاکٹر سے اپنا ایکسرے نہیں کروائے گا۔''

بتایئے؟ اب میں کہانی ڈھونڈنے کہاں جاؤں؟

آج میں نے اپنے بچپن کو یاد کیا ہے۔مگر یاد تو اسے کیا جاتا ہے جسے ہم بھول جاتے ہیں۔اب سوچ رہی ہوں کہ میرے بچپن میں کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔مگر وہ زمانہ، وہ لوگ، میرے آس پاس، مجھ سے دور دور کیوں نظر آتے ہیں؟

ماضی کے وہ رشتے دار، وہ دوست مجھے آج بھی روشنی دکھاتے ہیں وہ سب میرے آس پاس، میرے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

اور آج میرے چاروں طرف کتنا شور مچا ہوا ہے۔ سیاست، مذہب اور سائنس کی دہشت کے مارے ہوئے انسانوں کی چیخیں مجھے ساتھ دیتی ہیں۔ میرے ناولوں، افسانوں کے کردار میرے سامنے آکر مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

''سارے نمرود، فرعون، یزید، ہٹلر، سب اپنے اصولوں کے پکے تھے۔اور ان کے وارث آج تک ان کے مشن کی تکمیل کر رہے ہیں۔بانو بی بی......؟تم کیا کر رہی ہو آج......؟'' اور میں سر جھکا کر سوچ رہی ہوں۔

سائنس، مذہب اور سیاست کی دہشت میں جلتی ہوئی یہ دنیا جیسی آج ہے ویسی نہ رہے۔بس اب یہی کہانی لکھنا ہے مجھے۔

Printed at : Compudata Services, New Delhi – 20

جیلانی بانو اردو کی ممتاز فکشن قلم کار ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں
میں سماج کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے ان تجربات
ومشاہدات ذکر کیا ہے جو ان کے تخلیق کار بننے کا سبب بنیں۔ یہ خاص طور پر
نوجوان قاری کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئیں ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے
''روشنی کے مینار، پرایا گھر، رات کے مسافر، روز کا قصہ'' کو شہرت حاصل ہو
چکی ہے۔ ان کا ناول ''ایوان غزل، بارش سنگ، نروان، جگنو اور ستارے،
نغمے کا سفر'' کو بہت مقبولیت ملی ہے۔ این۔ بی۔ ٹی نے بھی ان کا ناول ایوانِ
غزل کو دیگر ہندوستانی زبانوں میں شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ انگلش میں
ان کی منتخب کہانیوں کا ترجمہ بہ عنوان: The Alien Home and
Other Stories بھی این۔ بی۔ ٹی نے شائع کیا ہے۔ این۔ بی۔ ٹی
سے ان کی دو کہانیاں بچوں کے لئے بھی شائع ہوئی ہیں۔